رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

جلد ۳ نومبر ۱۹۶۰ء عدد ۵

ماہنامہ

میثاق

لاہور

★

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

دفتر رسالہ میثاق

رحمان پورہ اچھرہ - لاہور (پاکستان)

قیمت فی پرچہ : دس آنے سالانہ : چھ روپے (بارہ شلنگ)

Monthly MEESAAQ Lahore

(رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰)

میثاق

جلد ۳ | بابت ماہ نومبر سنہ ۱۹۶۰ء مطابق جمادی الاول سنہ ۱۳۸۰ھ | عدد ۵

تذکرہ وتبصرہ — امین احسن اصلاحی — ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ — " — ۹

اجتماعیات وسیاسیات

اسلام کا شورائی نظام — مولانا سید جلال الدین صاحب عمری — ۲۰

مقالات

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب — مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی — ۳۳

سفر حج

سفر کی پہلی منزل — امین احسن اصلاحی — ۴۱

تقریظ وتنقید

اسلام کا نظامِ عدل — غ۔م — ۴۹

ہندوستانی خریداروں کے لیے ارسال زر کا پتہ

مینیجر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

میثاق کا یہ پرچہ اپنے معمول کے خلاف دیر سے شائع ہو رہا ہے۔ اس تاخیر کا سبب یہ ہے کہ اکتوبر میں ایڈیٹر میثاق ملیریا میں مبتلا ہو گیا جس کے اثرات مابعد سے اب تک اسے نجات حاصل نہ ہو سکی۔ مجھے اس بات کے لیے بڑا اہتمام رہتا ہے کہ پرچہ، جیسا برا بھلا بھی مرتب ہوتا ہے، وقت پر نکل جایا کرے لیکن ہر بات اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ اگر معاملہ کا انحصار صرف میری خواہش اور کوشش ہی پر ہوتا تو انشاء اللہ میں اس کی اشاعت میں کبھی ایک دن کا بھی فرق واقع نہ ہونے دیتا۔ قارئین سے التماس ہے کہ وہ مجبوریوں پر نگاہ رکھیں اور جس طرح میں نے اس کی یہ تاخیر گوارا کی ہے اسی طرح وہ بھی اس کو گوارا کریں۔

پچھلے پرچہ میں ان صفحات میں ہم نے اس فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی جو انبیاء علیہم السلام کے طریقہ کار اور عام اہل سیاست کے طریقہ کار میں ہوتا ہے لیکن جگہ کی تنگی کی وجہ سے بحث ناتمام رہ گئی تھی۔ اب اس بحث کو ہم پھر لے رہے ہیں اور کوشش کریں گے کہ اس صحبت میں یہ ناتمام بحث کم از کم اپنے اصولی مطالب کے حد تک تمام ہو جائے۔

۴۔ انبیاء علیہم السلام دنیا میں اللہ کا دین قائم کرنے کے لیے آئے اور اس مقصد کے لیے جس چیز کو انھوں نے

ذریعہ اور وسیلہ بنایا وہ تبلیغ و شہادت ہے۔ تبلیغ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین ان پر اتارا، انھوں نے بغیر کسی کمی بیشی، بغیر کسی دخل و تصرف اور بغیر کسی رد و بدل کے پوری وضاحت و صراحت کے ساتھ خلق خدا کو پہنچا دیا۔ نہ اس کے مزاج میں کوئی تغیر ہونے دیا، نہ اس کے مواد میں۔ نہ اس کی ترتیب میں کوئی تبدیلی پیدا کی، نہ اس کی تدریج میں۔ وہ اللہ کے دین کے امین تھے، اس کے موجد اور مصنف نہیں تھے۔ اس وجہ سے اپنی ذمہ داری انھوں نے ہر طرح کے حالات میں صرف یہ سمجھی کہ اس کے پیغام کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ انھوں نے اس بات کی پروا کبھی نہیں کی کہ اس دین کی تبلیغ حالات و مصالح کے مطابق ہے یا نہیں اور لوگ اس کو رد کریں گے یا قبول کریں گے۔ اگر مصلحت کے پرستاروں کی طرف سے کبھی یہ اصرار کیا گیا کہ فلاں بات میں اگر یہ ترمیم و اصلاح کر دی جائے تو وہ پورے دین کو بخوشی قبول کر لیں گے تو انھوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم اپنی جانب سے اس میں کسی رد و بدل کے مجاز نہیں ہیں۔ جس کا جی چاہے اس کو قبول کرے جس کا جی نہ چاہے وہ رد کر دے۔

شہادت کا مطلب یہ ہے کہ دل سے، زبان سے، قول سے، عمل سے، خلوت سے، جلوت سے، زندگی سے، موت سے، غرض اپنی ایک ایک ادا سے انھوں نے اس دین کی گواہی دی جس کے وہ داعی بن کر آئے۔ ان کی زندگی کی کتاب اور ان کی دعوت کی کتاب میں کوئی فرق نہیں ہوا۔ انھوں نے جس چیز سے دوسروں کو روکا اس سے پوری شدت کے ساتھ خود پرہیز کیا، جس چیز کا دوسروں کو حکم دیا اس پر خود پوری قوت و عزیمت کے ساتھ عمل کیا۔ ان کی دعوت اور ان کی زندگی کی یہی مکمل مطابقت درحقیقت ان کی دعوت کی صداقت کی وہ دلیل بنی جس کو ان کے کٹر سے کٹر دشمن بھی جھٹلانے کی جرأت نہ کر سکے۔

اس کے بالکل برعکس معاملہ اہل سیاست کا ہے۔ اہل سیاست خدا کا دین نہیں قائم کرتے بلکہ تحریک چلاتے ہیں۔ اگر وہ دین کا نام لیتے بھی ہیں تو وہ دین بھی ان کی تحریک ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جس جس وادی میں ان کی تحریک ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے، ان ساری وادیوں میں ان کا دین بھی بھٹکتا پھرتا ہے۔ ایک تحریک کیلیے تبلیغ اور شہادت کے معصوم ذریعے بالکل بیکار ہیں اس لیے اہل سیاست کا سارا اعتماد اپنے مقصد کی کامیابی کی راہ میں پروپیگنڈے پر رہتا ہے۔ پروپیگنڈا اور تبلیغ میں صرف انگریزی اور عربی ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ روح اور جوہر کا بھی فرق ہے۔ تبلیغ تو، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے صرف اللہ کے دین کو پورا پورا پہنچا دینا ہے لیکن پروپیگنڈے کا

مقصود پیشِ نظر تحریک کو کامیاب بنانا ہوتا ہے۔ یہ کامیابی جس طرح بھی حاصل ہو۔ پراپگنڈا ایک مستقل فن ہے جس کو زمانہ حال کی سیاسی تحریکات نے جنم دیا ہے اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان تمام اخلاقی حدود و قیود سے بالکل آزاد ہوتا ہے جن کی پابندی حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنے دعوتِ دین کے کام میں واجب سمجھی ہے۔

مناسب ہوگا کہ ہم مختصر طور پر یہاں پروپگنڈے کی چند خصوصیات کی طرف بھی اشارہ کر دیں تاکہ سیاسی تحریکات کے اس سب سے بڑے وسیلۂ کار اور تبلیغ کے درمیان جو فرق ہے وہ واضح ہو کر سامنے آجائے۔

پروپگنڈے کے اجزائے ترکیبی پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے اندر جزوِ اکبر کی حیثیت مبالغہ کو حاصل ہوتی ہے۔ بات کا بتنگڑ اور رائی کا پربت بنانا اس کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ کوئی مجمع ۵ سو کا ہوگا تو وہ اس کی بدولت اخبارات کی شاہ سرخیوں میں ۵ ہزار کا بن جائے گا۔ کسی کا استقبال دس آدمی کریں گے تو یہ دس آدمی پروپگنڈے کی کرشمہ سازی سے ۱ ہزار بن جائیں گے۔ کسی بستی یا شہر کے دو چار آدمی اگر کسی مسلک سیاسی کے ساتھ ذرا سی ہمدردی کا بھی اظہار کر دیں گے تو اس مسلک کے حامی اپنے اخبارات و رسائل میں یوں ظاہر کریں گے کہ گویا وہ پورا کا پورا شہر ان کی تائید و حمایت میں دیوانہ وار اُٹھ کھڑا ہوا ہے، اگر کسی باہر کے ملک سے تائید و ہمدردی کا ایک کارڈ بھی آجائے گا تو پریس میں اس کی تشہیر یوں ہوگی کہ فلاں ملک کو فلاں تحریک نے بالکل مسخر کر لیا ہے۔ اگر کوئی خدمت حقیقت کی ترازو میں چھٹانک ہوگی تو پروپگنڈے کی مشینری کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کو کم از کم من بھر دکھائے۔ اس جھوٹ اور مبالغہ آرائی کو موجودہ زمانہ میں ہمارے اہل سیاست نے اس طرح اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے کہ اب اس کے برائی ہونے کا شاید لوگوں کے اندر احساس بھی مردہ ہو گیا ہے۔ اس کوچہ میں بدنام تو اکیلا غریب گوئبلز ہے (اور اس کی یہ بدنامی بھی پروپگنڈے ہی کا کرشمہ ہے) لیکن حقیقت اور انصاف یہ ہے کہ اس سیاست کے حمام میں سب کو گوئبلز ہی کے اسوہ کی پیروی کرنی پڑتی ہے، خواہ کوئی شخص دنیا کا نام لیتا ہوا اس میں داخل ہو یا دین کا کلمہ پڑھتا ہوا داخل ہو۔

اس جھوٹ اور مبالغہ ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ اپنے موافق کو مدح و توصیف سے آسمان پر پہنچا دیا جائے اور جس کو مخالف قرار دے لیا جائے اس کے خلاف اتنے جھوٹ اور اتنی تہمتیں تراشی جائیں کہ وہ کہیں منہ

دکھانے کے قابل نہ رہ جائے۔ اسلام میں تو مدح و ذم اور تعریف و ہجو دونوں کے لیے نہایت سخت حدود و قیود ہیں اور کوئی شخص دین سے بے قید ہوئے بغیر اپنے آپ کو ان حدود و قیود سے آزاد نہیں کر سکتا لیکن سیاست میں صرف ایک ہی اصول چلتا ہے۔ وہ یہ کہ اپنے موافق کو آسمان پر پہنچاؤ اور اپنے مخالف کو تحت الثریٰ میں گراؤ اور اس مقصد کے لیے جس قسم کے جھوٹ اور جس نوع کے افترا کی ضرورت پیش آئے اس کو بے تکلف گھڑو اور بالکل بے خوف ہو کر اس کو لوگوں میں پھیلاؤ۔ صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات کتنی ہی بے حیائی اور بے شرمی کی سمجھی جائے لیکن اہل سیاست اپنی تحریکات کی کامیابی کے لیے اس چیز کو ناگزیر خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسی طرح وہ اشخاص اٹھتے ہیں جو تحریک کی گاڑی کو چلاتے ہیں، اور اسی طرح وہ اشخاص گرتے ہیں جو تحریک کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ خفض و رفع کا فلسفہ ایک مستقل فلسفہ ہے جس کے تحت کتنے بے علم ہیں جو مولانا اور علامہ کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور کتنے صاحب علم و تقویٰ ہیں جن کی پگڑیاں اچھلتی رہتی ہیں۔

۵۔ ایک اور چیز جو انبیاء علیہم السلام کے طریقۂ کار کو عام اہل دنیا کے طریقہ ہائے کار سے نمایاں کرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی تمام جد و جہد میں مطلوب و مقصود کی حیثیت صرف خدا کی خوشنودی اور آخرت کی کامیابی کو حاصل ہوتی ہے۔ اس چیز کے سوا کوئی اور چیز ان کے پیش نظر نہیں ہوتی۔ اگرچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی جد و جہد کی کامیابی سے اللہ کے دین کو اور دین کے لیے کام کرنے والوں کو دنیا میں بھی غلبہ اور تفوق حاصل ہوتا ہے لیکن وہ اس بات کی دعوت کبھی نہیں دیتے کہ آؤ حکومت الٰہیہ قائم کرو یا اقتدار حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کرو بلکہ دعوت صرف اللہ کے دین پر چلنے اور اس پر چلانے ہی کی دیتے ہیں۔ اس لیے کہ آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کے لیے خدا کے دین پر چلنا اور اسی پر دوسروں کو بھی چلنے کی دعوت دینا شرط ضروری ہے۔

اس کے برعکس اہل سیاست کی ساری تگ و دو کا مقصود اقتدار کا حصول ہوتا ہے۔ وہ اسی اقتدار کے حصول کے لیے اپنی تنظیم کرتے ہیں اور اسی کے لیے لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ یہ مقصود ایک خالص دنیوی مقصود ہے لیکن بعض لوگ اس پر دین کا ملمع کر کے اس چیز کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ یہ اقتدار اپنے لیے نہیں چاہتے بلکہ خدا کے لیے یا اس کے دین کے لیے چاہتے ہیں۔ جو لوگ معاملہ کو اس شکل میں پیش کرتے

ہیں، ضروری نہیں ہے کہ ان کی نیتوں پر شبہ کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ جس اقتدار کے حصول کے لیے جد و جہد کر رہے ہوں وہ خدا ہی کے لیے استعمال کریں لیکن اس سے جد و جہد کا نصب العین بالکل تبدیل ہو جاتا ہے اور اس نصب العین کی تبدیلی کا جد و جہد کی مزاجی خصوصیات پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھیے تو یہ نصب العین کی تبدیلی سارے کام ہی کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیتی ہے۔

ہم جس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں وہ اچھی طرح واضح اسی طرح ہوتی ہے کہ اہل سیاست جس دنیوی اقتدار کے حصول کو تمام خیر و فلاح کا ضامن سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ دین کی خدمت کا کوئی کام بھی ان کے نزدیک اس وقت تک انجام ہی نہیں دیا جا سکتا جب تک یہ اقتدار حاصل نہ ہو جائے۔ اس اقتدار کو انبیاء علیہم السلام نے اس نصب العین کے لیے نہایت خطرناک سمجھا ہے جس کے داعی وہ خود رہے ہیں۔ چنانچہ متعدد احادیث سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ آپ نے صحابہؓ کو اس بات سے آگاہ فرمایا کہ میں تمہارے لیے فقر و غربت سے نہیں ڈرتا بلکہ اس بات سے ڈرتا ہوں کہ دنیا کی عزت و ثروت تمہیں حاصل ہوگی اور تم اس کے انہماک میں اصل نصب العین یعنی آخرت کو بھول جاؤ گے۔ آپ کا ارشاد ہے، خدا کی قسم میں تمہارے لیے فقر سے نہیں ڈرتا بلکہ جس بات سے ڈرتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ دنیا جس طرح تم سے پہلے والوں کے لیے کھول دی گئی اسی طرح تمہارے لیے بھی کھول دی جائے گی، پھر جس طرح وہ اس کی بھاگ دوڑ میں مبتلا ہو گئے اسی طرح تم بھی اس کے لیے بھاگ دوڑ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ پھر یہ تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر چھوڑے گی جس طرح اس نے تمہارے پہلوں کو ہلاک کر چھوڑا۔

مذکورہ حدیث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جد و جہد میں اصل مطمح نظر کی حیثیت آخرت کو حاصل ہوتی ہے۔ دنیا کا اقتدار اس نصب العین کے لیے مفید بھی ہو سکتا ہے اور مضر بھی بلکہ مضر ہونا زیادہ اقرب ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ انبیاء علیہم السلام کے طریقہ پر کام کرتے ہیں وہ اس اقتدار کو بھی خدا کی ایک بہت بڑی آزمائش سمجھتے ہیں اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح غربت اور فقر کے دور میں انھیں آخرت کے لیے کام کرنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے اسی طرح امارت و سیادت کے دور میں بھی اس نصب العین پر قائم رہنے کی سعادت حاصل ہو۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت

میں اس امر کا کوئی ادنیٰ نشان بھی نہیں ملتا کہ اقتدار کو انھوں نے اصل نصب العین سمجھا ہو یا اصل نصب العین کے لیے اس کو کوئی بڑی سازگار چیز سمجھا ہو۔

ہماری اس تقریر سے کسی صاحب کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم یہ رہبانیت کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہم رہبانیت کی دعوت نہیں دے رہے ہیں بلکہ اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی تمام جد و جہد کا مقصود صرف آخرت ہوتی ہے۔ وہ اسی کے لیے خلق خدا کو دعوت دیتے ہیں، اسی کے لیے لوگوں کو منظم کرتے ہیں، اسی کے لیے جیتے ہیں اور اسی کے لیے مرتے ہیں۔ اسی چیز سے ان کی جد و جہد کا آغاز ہوتا ہے اور اسی چیز پر اس کی انتہا ہوتی ہے۔ ان کی تمام سرگرمیوں میں محرک کی حیثیت بھی اسی چیز کو حاصل ہوتی ہے اور غایت و مقصود کی حیثیت بھی اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ دنیا کو آخرت کے منافی نہیں قرار دیتے بلکہ دنیا کو آخرت کی کھیتی قرار دیتے ہیں۔ ان کی دعوت یہ نہیں ہوتی کہ لوگ دنیا کو چھوڑ دیں بلکہ اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا کو آخرت کے لیے استعمال کریں۔

ان کے ہر کام پر ان کے اس نصب العین کے حاوی ہونے کا خاص اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی جد و جہد میں کسی ایسی چیز کو کبھی گوارا نہیں کرتے جو ان کے اس اعلیٰ نصب العین کی عزت و حرمت کو بٹہ لگانے والی ہو۔ ان کے مقصد کی طرح ان کے وسائل و ذرائع بھی نہایت پاکیزہ ہوتے ہیں۔ وہ کامیابی حاصل کرنے کی دھن میں کبھی ایسی چیزوں کا سہارا حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے جن کی پاکیزگی مشتبہ اور مشکوک ہو۔ ان کی کامیابی اور ناکامی کی فیصلہ کرنے والی میزان بھی چونکہ اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں ہے اس وجہ سے ان کی کامیابی اور ناکامی کے معیارات بھی عام اہل سیاست کے معیارات سے بالکل مختلف ہیں۔ اہل سیاست کے ہاں تو کامیابی کا معیار ان کے نصب العین کے لحاظ سے یہ ہے کہ ان کو دنیا میں اقتدار حاصل ہو جائے، اگر یہ چیز ان کو حاصل نہ ہو سکے تو پھر وہ ناکام و نامراد ہیں لیکن انبیاء کے طریقہ پر جو لوگ کام کرتے ہیں ان کی کامیابی کے لیے اقتدار کا حصول کوئی شرط نہیں ہے۔ ان کی کامیابی کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقہ پر صرف اسی کی رضا کے لیے کام کرتے چلے جائیں یہاں تک کہ اسی حالت پر ان کا خاتمہ ہو جائے۔ اگر یہ چیز ان کو حاصل ہو گئی تو وہ کامیاب ہیں اگرچہ ان کے سایہ کے

سوا کوئی ایک متنفس بھی اس دنیا میں ان کا ساتھ دینے والا نہ بن سکا ہو اور اگر یہ چیز ان کو حاصل نہ ہو سکی تو وہ ناکام ہیں اگرچہ انھوں نے تمام عرب وعجم کو اپنے اردگرد اکٹھا کر لیا ہو۔

(بقیہ اسلام کا شورائی نظام) کیا اس سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جانتے بوجھتے حق پر پردہ ڈال دے گا ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، مَنْ اَشَارَ عَلٰی اَخِیْہِ بِاَمْرٍ یَعْلَمُ اَنَّ الرُّشْدَ فِیْ غَیْرِہٖ فَقَدْ خَانَہٗ[1] (جو شخص اپنے بھائی کو کسی بات کا مشورہ دے اور وہ جانتا ہو کہ بھلائی دوسرے مشورہ میں ہے تو اس نے اپنے بھائی کے ساتھ خیانت کی) اسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک اور صالح مشیروں کے انتخاب کی طرف ایک اچھوتے انداز میں آمادہ کیا ہے:

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِالْاَمِیْرِ خَیْرًا جَعَلَ لَہٗ وَزِیْرَ صِدْقٍ اِنْ نَسِیَ ذَکَّرَہٗ وَاِنْ ذَکَرَ اَعَانَہٗ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰہُ غَیْرَ ذٰلِکَ جَعَلَ لَہٗ وَزِیْرَ سُوْءٍ اِنْ نَسِیَ لَمْ یُذَکِّرْہُ وَاِنْ ذَکَرَ لَمْ یُعِنْہُ[2]

جب اللہ کسی امیر کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے ایک سچا وزیر عطا کرتا ہے جو اس کی غفلت پر یاد دہانی کرتا ہے اور اگر وہ یاد کر لیتا ہے تو اس کی مدد کرتا ہے اور جب اللہ کسی امیر کے ساتھ بھلائی نہیں چاہتا تو اس کے لیے ایک برا وزیر مقرر کر دیتا ہے جو اس کے بھولنے پر یاد نہیں دلاتا اور اگر وہ یاد بھی کر لیتا ہے تو اس کی مدد نہیں کرتا۔

•

امام شافعی فرماتے ہیں :-

وَلَا یَنْبَغِیْ لَہٗ (اَیِ الْحَاکِمِ) اَنْ یُّشَاوِرَ جَاھِلًا لِاَنَّہٗ لَا مَعْنٰی لِمُشَاوَرَتِہٖ وَلَا عَالِمًا غَیْرَ اَمِیْنٍ فَاِنَّہٗ رُبَّمَا اَضَلَّ مَنْ یُّشَاوِرُہٗ وَلٰکِنَّہٗ یُشَاوِرُ مَنْ جَمَعَ الْعِلْمَ وَالْاَمَانَۃَ[3]

حاکم کو کسی جاہل سے مشورہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ جاہل سے مشورہ کرنا ایک بے معنی سی بات ہے اور نہ ایسے عالم سے مشورہ کرنا چاہیے جو اپنے مشورہ میں امین نہ ہو کیونکہ وہ مشورہ لینے والے کو گمراہ کر سکتا ہے لہٰذا حاکم کو ایسے شخص سے مشورہ کرنا چاہیے جو علم و امانت دونوں کا جامع ہو۔

یہ ہے مشیروں کی ذمہ داریوں کا ایک اجمالی نقشہ جسے شریعت نے پیش کیا ہے۔ (باقی آئندہ)

---

[1] ابوداؤد کتاب العلم باب التوقی فی الفتیا [2] ابوداؤد باب اتخاذ الوزیر [3] کتاب الام جلد ۷ صفحہ ۸۶

•

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۱۶)

لن نؤمن لك .... وانتم تنظرون ہم تمہارا یقین اس وقت تک نہیں کرنے کے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں — بنی اسرائیل شرک کے ایسے مریض تھے کہ انھیں کسی طرح یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ سے کلام بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ خداوند تمھیں یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب خدا تم سے کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اس کو آنکھوں سے دیکھیں، اس کے بغیر ہم تمہاری بات کی صحت کس طرح تسلیم کر لیں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے، یہ خواہش کوئی قابل ملامت خواہش نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ خواہش کی تھی لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ یہ خواہش شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے ہو اور اس بات میں کہ اس کو انکار اور تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تاکہ آخرت کے باب میں انھیں پورا پورا شرح صدر حاصل ہو جائے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ صرف یہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے، صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔ قرآن مجید میں اس کی تفصیل اس طرح ہے:-

وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَہٗ رَبُّہٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْۤ اَنْظُرْ اِلَیْکَ قَالَ لَنْ

اور جب موسیٰ ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر آیا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا تو اس نے کہا کہ اے خداوند

تَرَانِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرَانِیْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَہٗ دَکًّا وَّخَرَّ مُوْسٰی صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَکَ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔

(۱۴۳ - اعراف)

تو مجھے اپنے آپ کو دکھا، میں تجھے دیکھوں گا۔ فرمایا تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، البتہ پہاڑ کی طرف دیکھو، اگر وہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہ سکے تو تم مجھے دیکھ سکو گے۔ تو جب اس کے رب نے اپنی تجلی پہاڑ پر ڈالی تو اس کو پاش پاش کر دیا اور موسیٰ غش کھا کر گر پڑے۔ پھر جب ہوش میں آئے تو بولے اے رب تو پاک ہے، میں نے توبہ کی اور میں پہلا ایمان لانے والا بنتا ہوں۔

برعکس اس کے بنی اسرائیل کے لوگوں کا یہ مطالبہ محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ اللہ تعالیٰ کی نہایت کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قدم قدم پر کرتے رہتے تھے اس وجہ سے ان پر عتاب ہوا۔

یہ عتاب یہاں فاخذتکم الصاعقۃ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اور سورہ اعراف ۱۵۵ میں فلما اخذتھم الرجفۃ کے الفاظ سے۔ لفظ صاعقہ کی تحقیق ہم سترھویں فصل میں بیان کر چکے ہیں اس کے معنی گرج اور کڑک کے بھی ہیں اور اس بجلی کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے جو کڑک کے ساتھ گرتی ہے۔ رجفہ کے معنی زلزلہ کے ہیں۔ ایک ہی واقعہ سے متعلق قرآن نے دو مقامات میں جو بظاہر دو الگ لفظ استعمال کیے ہیں ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ ایک ہی حادثہ کے دو مختلف اثرات ہیں جو بیک وقت ظاہر ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مشاہدہ کرانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلی جب پہاڑ پر ڈالی تو جس طرح پہاڑ پاش پاش ہو گیا اسی طرح بنی اسرائیل کے مطالبہ پر جب اس کی تجلی ظاہر ہوئی ہے تو وہ صاعقہ کی شکل میں نمودار ہوئی جس نے سارے پہاڑ میں زلزلہ ڈال دیا اور یہ لوگ بھونچکے ہو کر گر پڑے۔

ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ | اس صاعقہ اور زلزلہ سے ان ستر سرداروں پر جو اس موقع پر حضرت موسیٰ[1]

[1] قرآن مجید سے واضح ہوتا ہے کہ یہ اس موقع کی بات ہے جب گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے ستر منتخب آدمیوں کو لے کر طور پر اس مقصد سے گئے تھے کہ اپنی قوم کے لیے معافی مانگیں اور اس کام میں (باقی اگلے صفحہ پر)

کے ساتھ طور پر گئے تھے کچھ حالت طاری ہوئی قرآن مجید نے اس کو موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطریق استعارہ بیہوشی بھی۔ عربی زبان میں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر نیند اور بیہوشی کے لیے بھی استعمال ہوا ہے[2]۔ چنانچہ سو کر اٹھنے کے بعد کی جو مشہور دعا احادیث میں نقل ہوئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں، الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور (اس اللہ کے لیے شکر ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے) اسی طرح بعث کا لفظ بھی اصحاب کہف کے واقعہ میں ان کو نیند سے بیدار کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

اگرچہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی کے سبب سے سزاوار تو اسی بات کے تھے کہ ان کو دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل خاص سے ان کو مزید مہلت بخشی اور ان کے پیغمبر نے بھی اس موقع پر ان کے لیے بڑی دل سوزی کے ساتھ دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی ہے۔ سورہ اعراف میں اس کا حوالہ اس طرح آیا ہے:۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰی قَوْمَہٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا لِّمِیْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْھُمُ الرَّجْفَۃُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَھْلَکْتَھُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِیَّایَ ؕ اَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ السُّفَھَآءُ مِنَّا ۚ اِنْ ھِیَ اِلَّا فِتْنَتُکَ ؕ تُضِلُّ بِھَا مَنْ تَشَآءُ وَتَھْدِیْ مَنْ تَشَآءُ ؕ اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغٰفِرِیْنَ

اور موسیٰ نے ہمارے مقررہ وقت پر حاضری کے لیے اپنی قوم سے ستر آدمی منتخب کیے تو جب ان کو زلزلے نے آپکڑا تو موسیٰ نے دعا کی کہ اے رب اگر تو چاہتا تو ان کو اور مجھ کو پہلے ہی ہلاک کر چھوڑتا، کیا تو اس جرم میں ہم سب کو ہلاک کرے گا جو ہم میں سے بیوقوفوں نے کیا ہے۔ یہ تو بس تیری آزمائش تھی۔ اس کے ذریعہ سے تو جس کو چاہے گمراہ کرے اور جس کو چاہے ہدایت دے، تو ہمارا مددگار

(بقیہ حاشیہ پچھلے صفحہ کا) اپنی قوم کے ان لیڈروں کو بھی شریک کریں۔

[2] لسان العرب میں ہے، مات الرجل وھمد وھوم اذا نام .... الموت السکون وکل ما سکن فقد مات .... وفی حدیث دعاء الانتباہ: الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور سمی النوم موتا لانہ یزول معہ العقل والحرکۃ تمثیلا وتشبیھا لا تحقیقا وقیل الموت فی کلام العرب یطلق علی السکون یقال ماتت الریح ای سکنت ومنھا المنام لقولہ تعالی والتی لم تمت فی منامھا وقیل المنام الموت الخفیف والموت النوم الثقیل .... والموتۃ جنس من الجنون والصرع یعتری الانسان فاذا افاق عاد الیہ عقلہ کالنائم والسکران۔ والموتۃ الغشی۔

(اعراف - ۱۵۵) تو ہمیں بخشش اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین بخشنے والا ہے۔

وظللنا علیکم الغمام ... ولکن کانوا انفسھم یظلمون یہ ان انعامات کا بیان ہے جو بنی اسرائیل پر صحرائے سینا میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دھوپ اور فاقے کی مصیبت سے بچانے کے لیے کیے۔

مَنّ کے اصل معنی فضل و احسان کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد وہ خاص غذا ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے لیے صحرائے سینا میں خاص اپنے فضل سے مہیا فرمائی جس کے لیے نہ انھیں ہل چلانے پڑے، نہ تخم ریزی اور آب پاشی کی زحمتیں اٹھانی پڑیں۔ تورات میں اس کی تفصیل اس طرح بیان ہوئی ہے:

"اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا اور صبح کو خیمہ گاہ کے آس پاس اوس پڑی ہوئی تھی اور جب اوس جو پڑی ہوئی تھی سوکھ گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی، چھوٹی گول چیز، ایسی چھوٹی جیسے پالے کے دانے ہوتے ہیں، زمین پر پڑی ہے۔ بنی اسرائیل اس کو دیکھ کر آپس میں کہنے لگے مَن؟ کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰؑ نے ان سے کہا یہ وہی روٹی ہے جو خداوند نے کھانے کو تم کو دی ہے.... اور وہ ہر صبح کو اپنے اپنے کھانے کی مقدار کے مطابق جمع کر لیتے تھے اور دھوپ تیز ہوتے ہی وہ پگھل جاتا تھا۔ خروج ۱۶: ۱۳-۲۱۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شبنم کی طرح ایک چیز زمین پر ٹپکتی تھی اور پالے کے دانوں کی طرح وہ جم جاتی تھی۔ آفتاب کی تمازت بڑھنے سے پہلے پہلے اس کا جمع کر لینا ممکن ہوتا تھا۔ تمازت بڑھنے کے بعد یہ دانے پگھل جاتے تھے۔ چونکہ یہ نعمت، جیسا کہ عرض کیا گیا، بغیر کوئی زحمت و مشقت اٹھائے حاصل ہوئی تھی اور ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں حاصل ہوئی تھی جہاں فراہمیِ غذا کے اسباب و وسائل مفقود تھے، اس وجہ سے اس کا نام مَن قرار پایا (یہ واضح رہے کہ عربی اور عبرانی دونوں قریب المأخذ زبانیں ہیں)

من کے وجہ تسمیہ سے متعلق یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے لیکن تورات کا مذکورہ بالا اقتباس یہ ظاہر کرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے جب اس عجیب و غریب چیز کو دیکھا تو ان کے اندر یہ سوال پیدا ہوا کہ من ھو یہ کیا ہے؟ ان کے اسی سوال سے اس کا نام من پڑ گیا۔ ہمارے نزدیک یہ وجہ تسمیہ محض یہود کی بدمذاقی کی ایک ایجاد ہے۔ نہ لغت اس کی تائید کرتا ہے، نہ عقل سلیم اس کو قبول کرتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس چیز کو جو روٹی سے تعبیر فرمایا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سچ مچ یہ روٹی کی قسم کی کوئی چیز تھی، بلکہ روٹی یہاں غذا کے مفہوم میں ہے۔ غذا کے مفہوم کی تعبیر کے لیے یہ لفظ قدیم صحیفوں میں بہت استعمال ہوا ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ لفظ اس مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔

سلویٰ:- من کی طرح لفظ سلویٰ بھی عربی میں اہل کتاب کے واسطہ سے آیا ہے اور اہل عرب نے اس کو اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ ان پرندوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کے لیے بھیجے۔ یہ بٹیروں سے ملتے جلتے تھے، اور بٹیروں ہی کی طرح ان کا شکار نہایت آسان تھا۔ خروج میں ان کی تفصیل اس طرح آئی ہے:-

"پھر وہ ایلیم سے روانہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی ساری جماعت ملک مصر سے نکلنے کے بعد دوسرے مہینے کی پندرھویں تاریخ کو سین کے بیابان میں، جو ایلیم اور سینا کے درمیان ہے پہنچی اور اس بیابان میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت موسیٰؑ اور ہارونؑ پر بڑبڑانے لگی؛ اور بنی اسرائیل کہنے لگے کاش کہ ہم خداوند کے ہاتھ سے ملک مصر میں جب ہی مار دیے جاتے جب ہم گوشت کی ہانڈیوں کے پاس بیٹھ کر دل بھر کر روٹی کھاتے تھے کیونکہ تم تو ہم کو اس بیابان میں اسی لیے لے آئے ہو کہ سارے مجمع کو بھوکا مارو..... اور خداوند نے موسیٰؑ سے کہا، میں نے بنی اسرائیل کا بڑبڑانا سن لیا ہے۔ سو تو ان سے کہہ دے کہ شام کو تم گوشت کھاؤ گے اور صبح کو تم روٹی سے سیر ہو گے اور تم جان لو گے کہ میں خداوند تمہارا خدا ہوں۔ اور یوں ہوا کہ شام کو اتنی بٹیریں آئیں کہ ان کی خیمہ گاہ کو ڈھانک لیا۔ (خروج ۱۶: ۱-۱۳)

کلوا من طیبات ما رزقنٰکم (کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں) اس طرح کے مواقع پر عام طور پر ہمارے مفسرین قلنا کا لفظ محذوف مانتے ہیں۔ یعنی ہم نے یہ چیزیں ان کو بخشیں اور کہا کہ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس طرح کے مواقع پر 'کہا' کا لفظ محذوف کر دینے میں ایک خاص بلاغت ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت اپنی صورت و ہیئت یا بالفاظ دیگر اپنی زبان حال سے بھی یہ دعوت دیتی ہے کہ اس نعمت الٰہی سے فائدہ اٹھاؤ اور اپنے پروردگار کے شکرگزار رہو۔ یہ اشارات قرآن مجید میں کہیں کہیں کھول دیے گئے ہیں اور بعض جگہ (جیسا کہ یہاں ہے) محض چھوڑ دیے گئے ہیں جن کے اندر ہی کائنات

کی بخشی ہوئی نعمتوں کی اشارات سمجھنے والی عقل ہوتی ہے۔ وہ ان اشارات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

یہاں کلام کا سیاق و سباق اس امر کو واضح کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی ان عظیم نعمتوں کا حق نہیں پہچانا۔ وہ ان نعمتوں کو پا کر شکر گذار بننے کے بجائے ان کی ناقدری اور خدا کی نافرمانی کرتے رہے۔ یہ بات چونکہ سیاق کلام سے واضح ہے۔ اس وجہ سے لفظوں میں ظاہر نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی جگہ پر یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ "انھوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم کرتے رہے۔ اس فقرہ سے بنی اسرائیل کا ان نعمتوں سے متعلق رویہ بھی واضح ہو گیا اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو لوگ خدا کی کسی نعمت کی ناقدری کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ اپنا ہی بگاڑتے ہیں۔ یہ آخری بات اوپر کی باتوں کی طرح یہود کو براہ راست مخاطب کر کے کہنے کے بجائے ان سے منہ پھیر کر غائب کے صیغہ سے کہی گئی ہے جس سے ان کی طرف سے متکلم کی بیزاری کا اظہار ہو رہا ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ ... وَسَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ | قریہ کے معنی اہل لغت میں جمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ عربی میں کہیں گے قری الماء فی الحوض (اس نے حوض میں پانی جمع کر دیا) یہیں سے یہ لفظ بستی کے معنی میں استعمال ہوا اس لیے کہ وہ لوگوں کے مجتمع ہونے کی جگہ ہوتی ہے۔ اس لفظ کے استعمالات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف چھوٹے دیہات ہی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ بڑے بڑے شہروں اور مرکزی آبادیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس قریہ سے یہاں مراد سرزمین فلسطین ہی کا کوئی شہر ہو سکتا ہے اس لیے کہ آگے فکلوا منہا حیث شئتم رغدا کے الفاظ سے اس کی جو تعریف وارد ہے وہ اسی سرزمین کے کسی شہر پر منطبق ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد اریحا یا یریحو ہو حضرت ابن عباس اور ابن زید کی یہی رائے ہے۔ فلسطین کے علاقہ کا یہی شہر بنی اسرائیل کے قبضہ میں سب سے پہلے آیا ہے۔

ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا | سجدہ کے اصل معنی سر جھکانے کے ہیں۔ اس سر جھکانے کے مختلف درجے ہو سکتے ہیں۔ اس کی کامل شکل زمین پر پیشانی رکھ دینے کی ہے جو ہم نماز میں اختیار کرتے ہیں۔ عمرو بن کلثوم نے اپنے مشہور فخریہ شعر میں اس کا یہی کامل مفہوم لیا ہے۔

اذا بلغ الفطام لنا صبی　　　تخر لہ الجبابر ساجدینا

(جب ہماری قوم کا کوئی بچہ دودھ چھوٹنے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اس کے آگے سجدوں میں گرتے ہیں)

یہاں آیت میں اس سے مراد صرف سر جھکانا ہے۔ موقع کلام اس پر دلیل ہے۔

الباب سے مراد بعض لوگوں نے بستی کا دروازہ لیا ہے، بعض لوگوں نے خیمہ عبادت کا دروازہ۔[1] میں اس دوسرے قول کو ترجیح دیتا ہوں۔ مفتوح شہر کے دروازوں میں متواضعانہ داخل ہونے کی نصیحت بھی اگرچہ ایک قیمتی نصیحت ہے لیکن یہ نصیحت ایک ایسی قوم کے لیے موزوں ہو سکتی ہے جو بہادر اور زور آور ہو۔ بنی اسرائیل کا حال تو یہ تھا کہ جب دشت فاران میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو فلسطین پر فوج کشی کا حکم دیا ہے تو ان کے دل بیٹھ گئے اور انھوں نے صاف صاف جواب دے دیا کہ اس ملک میں جبار اور زور آور لوگ ہیں اس وجہ سے ہم ان سے مقابلے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ تم اور تمہارا خدا دونوں جا کر لڑو، جب ان جباروں سے علاقہ خالی ہو جائے گا تو ہم داخل ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے یہ نصیحت کچھ غیر ضروری ہی سی معلوم ہوتی ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ نہ داخل ہوں بلکہ عاجزانہ سرفگندہ ہو کر داخل ہوں۔ اس وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ یہاں دروازہ سے مراد خیمہ عبادت کا دروازہ ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی اور شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں اور خیمہ عبادت میں عاجزانہ حاضر ہو کر خدا کا شکر ادا کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں، لیکن جس طرح انھوں نے ہر نعمت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی۔

قُولُوا حِطَّةٌ : حطۃ کا لفظ ایک جملہ کے قائم مقام ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے یقولون طاعۃ (وہ کہتے ہیں) اس وجہ سے یہاں مبتدا کو محذوف ماننا پڑے گا۔ زمخشری نے اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ مسئلتنا حطۃ (ہماری درخواست حطہ ہے) حطۃ حطّ سے ہے جس کے معنی جھاڑ دینے کے ہیں، یہاں مراد اس سے گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبرانی دونوں کے قریب الماخذ ہونے کے سبب سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مادہ جھاڑ دینے

[1] ملاحظہ ہو تفسیر علامہ ابی السعود

اور بخش دینے ہی کے مفہوم میں عبرانی میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہ ان کے ہاں استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا، وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا۔

محسنین عربی میں احسن الی فلان کے معنی ہوں گے۔ فلاں کے ساتھ احسان کیا اور احسن الشئی کے معنی ہوں گے اس چیز کو بہت خوبی کے ساتھ کیا اسی وجہ سے محسن کا لفظ عربی میں احسان کرنے والے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی عمل کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دینے والے کے لیے بھی۔ موقع کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اسی دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے، اردو میں اس کے لیے کوئی خوبصورت لفظ سمجھ میں نہیں آیا۔ اسی وجہ سے ترجمہ میں صرف مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

فبدل الذین ظلموا قولا ... بما کانوا یفسقون یعنی دعا کے لیے جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا، اس کو انھوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مراد الفاظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ پرانوں میں سے ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بدّل کا لفظ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے (جیسا کہ یہاں ہے اگرچہ ایک محذوف ہے) تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی۔ پھر جب واضح الفاظ میں یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ ظالموں نے اس قول کو جو ان سے کہا گیا تھا ایک دوسرے قول سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہا گیا تو اس سے صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی مراد لینا الفاظ قرآن سے صریح انحراف ہے۔

بہرحال ہمارے نزدیک یہاں صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے الفاظ دلالت کر رہے ہیں کہ بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے حطۃ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ انھوں نے کس لفظ سے اس کو بدلا تھا تو قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے۔ اہل تاویل سے مختلف اقوال منقول ہیں جن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی جزم کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے۔

مجھے کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنی سورہ فاتحہ کے فقروں کے مفہوم میں تبدیلی کر دی اسی طرح کی تبدیلی بنی اسرائیل نے اپنی اس دعا کے مفہوم میں کر دی۔ نصاریٰ کی فاتحہ مندرجہ لوقا باب ۱۱ ۱-۴ میں یہ الفاظ جو

آتے ہیں "ہماری روز کی روٹی ہمیں دیا کر" ظاہر ہے کہ اصل دعا کے مفہوم سے بالکل ہٹے ہوئے ہیں۔ اصل دعا تو یوں ہوگی کہ ہمیں وہ روح ہدایت بخش جو صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتی ہے[1]۔ لیکن چونکہ عبرانی میں روٹی کے لیے جو لفظ ہے وہ روحانی غذا اور مادی روٹی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اس وجہ سے ہدایت کی تعبیر کے لیے یہی مشترک لفظ استعمال ہوا ہوگا۔ بعد میں ترجموں میں آکر ہدایت کی روح غائب ہو گئی، صرف روٹی بچ رہی۔ اسی طرح کی کوئی تبدیلی بنی اسرائیل نے بھی دعا کے الفاظ میں کر دی جس سے دعا کی اصل روح بالکل بدل گئی۔

فانزلنا علی الذین ظلموا رجزا من السماء رجز اور رجس، دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب اور ارتعاش ہے۔ یہیں سے یہ گندگی اور نجاست کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ گندگی اور نجاست کو دیکھ کر طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب اور گھن پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عذاب کے لیے استعمال ہوئے کیونکہ عذاب بھی دلوں میں ایک اضطراب اور کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ من السماء (آسمان سے) کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس حادثہ کی نوعیت عام حوادث سے بالکل مختلف نوعیت کی تھی اس میں قدرت کی غضبناکی کا پہلو بہت نمایاں تھا۔ تورات کے بعض مقامات میں اس مخصوص نوعیت کی یوں وضاحت کی گئی ہے۔

"اگر یہ آدمی ویسی ہی موت سے مریں جو سب لوگوں کو آتی ہے یا ان پر ویسے ہی حادثے گذریں جو سب پر گذرتے ہیں تو میں خداوند کا بھیجا ہوا نہیں ہوں پر اگر خداوند کوئی نیا کرشمہ دکھائے اور زمین اپنا منہ کھول دے اور ان کو ان کے گھر بار سمیت نگل جائے اور یہ جیتے جی پاتال میں سما جائیں تو تم جاننا کہ ان لوگوں نے خداوند کی تحقیر کی ہے۔ (۲۹-۳۰)

قرآن نے مذکورہ عذاب کی اسی مخصوص نوعیت کو من السماء کے لفظ سے ظاہر کیا ہے۔ جس طرح ہم کسی ہولناک آفت کو قہر آسمانی سے تعبیر کرتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا تو خاص اس قریہ سے متعلق جس کا یہاں ذکر ہے، اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے۔ البتہ تورات کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس سفر کے دوران میں متعدد بار بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کی شدید نافرمانیاں کیں اور ان نافرمانیوں کی پاداش میں وہ مختلف وباؤں کے شکار ہوئے۔ مثلاً جس زمانہ

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کی تفسیر سورہ فاتحہ

میں بنی اسرائیل شطیم میں (جو ارضِ فلسطین کے بالکل پاس کا ایک شہر تھا) پہنچے تو ان لوگوں نے موآبی عورتوں کے ساتھ بدکاریاں کیں، ان کی دعوت پر یہ لوگ ان کی مشرکانہ قربانیوں میں شریک ہونے لگے اور اس طرح بالواسطہ ان کے دیوتا بعل فغور کی پرستش شروع کر دی جس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت وبا بھیجی جس میں ان کے چوبیس ہزار نفوس ہلاک ہوئے۔

کتاب گنتی کے باب ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے موآب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہونا تو تم یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا، ان کے شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ جیسا میں نے تم کو ان کے ساتھ کرنے کے لیے کہا ہے ویسا ہی میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اس قسم کی کوئی وبا آئی جس قسم کی وبا ان پر شطیم میں آئی تھی۔

واذ استسقیٰ موسیٰ ..... ولا تعثوا فی الارض مفسدین | تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پانی کے لیے یہ دعا دشتِ صین میں کی ہے۔ کتاب گنتی باب ۲۰ میں ہے :-

"اور پہلے مہینہ میں بنی اسرائیل کی ساری جماعت دشتِ صین میں آ گئی اور وہ لوگ قادس میں رہنے لگے .... اور جماعت کے لوگوں کے لیے وہاں پانی نہ ملا۔ سو وہ موسیٰ اور ہارون کے خلاف اکٹھے ہوئے اور لوگ موسیٰ سے جھگڑنے اور یہ کہنے لگے کاش ہم بھی اس وقت مر جاتے جب ہمارے بھائی خداوند کے حضور مرے۔ تم خداوند کی جماعت کو اس دشت میں کیوں لے آئے ہو کہ ہم بھی اور ہمارے جانور بھی یہاں مریں اور تم نے کیوں ہم کو مصر سے نکال کر اس بری جگہ پہنچایا ہے۔ یہ تو بونے کی اور انجیروں اور تاکوں اور اناروں کی جگہ نہیں ہے بلکہ یہاں تو پینے کے لیے پانی تک میسر نہیں اور موسیٰ اور ہارونؑ جماعت کے پاس سے جا کر خیمۂ اجتماع کے دروازے پر اوندھے منہ گرے۔ تب خداوند کا جلال ان کے اوپر ظاہر ہوا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اس لاٹھی کو لے اور تو اور تیرا بھائی ہارون تم دونوں جماعت کو اکٹھا کرو اور ان کی آنکھوں کے سامنے اس چٹان سے کہو کہ وہ اپنا پانی دے اور تو ان کے لیے چٹان

ہی سے پانی نکالنا۔ یوں جماعت کو اور ان کے چوپایوں کو پلانا۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے حضور سے اس کے حکم کے مطابق وہ لاٹھی لی اور موسیٰ اور ہارون نے جماعت کو اس چٹان کے سامنے اکٹھا کیا اور اس نے ان سے کہا سنو اے باغیو! کیا ہم تمہارے لیے اس چٹان سے پانی نکالیں۔ تب موسیٰ نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور اس چٹان پر دو بار لاٹھی ماری اور کثرت سے پانی بہہ نکلا اور جماعت نے اور ان کے چوپایوں نے پیا۔ (گنتی باب ۲۰- ۱-۱۲)

قد علم کل اناس مشربھم : قد علم یعنی جان لیا، متعین کر لیا۔ چونکہ پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹے تھے اور بنی اسرائیل کے خاندان بھی بارہ ہی تھے اس وجہ سے ہر خاندان نے اپنے اپنے گھاٹ الگ الگ متعین کر لیے اور اس چیز کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ پانی کے لینے پر کوئی جھگڑا برپا ہو۔ اگر اس بہتات کے ساتھ پانی کا انتظام نہ ہوا ہوتا تو اس صحرا میں ان لوگوں کے اندر روز پانی پینے پلانے ہی پر تلواریں کھنچی رہتیں۔ اس وجہ سے یہ واقعہ صرف ایک عظیم معجزہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک عظیم احسان بھی تھا۔

کلوا واشربوا ... الایۃ ، جس طرح من و سلویٰ کی نعمت کے ذکر کے بعد آیت ۵۷ میں فرمایا، کلوا من طیبات ما رزقنکم (ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے بخشی ہیں کھاؤ) اسی طرح اس پانی کے انتظام کا حوالہ دینے کے بعد فرمایا کلوا واشربوا من رزق اللہ ولا تعثوا فی الارض مفسدین (کھاؤ اور پیو اللہ کے رزق میں سے اور زمین میں فساد مچاتے ہوئے نہ پھیلو) یہ اس عظیم نعمت کا حق بیان ہوا ہے جس کا ذکر اوپر ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت جو ہمیں حاصل ہوتی ہے زبانِ حال سے ہمیں اس حق کی یاد دہانی بھی کرتی ہے جو اس سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے ہم پر عائد ہوتا ہے۔ یہ اس حق کی تعبیر ہے اور انسان کی فطرت اگر کفرانِ نعمت کی سیاہی سے مسخ نہ ہو چکی ہو تو وہ اس حق سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہی کی صدا ہے جو وحیِ الٰہی اس کے کانوں کو سنا رہی ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنے کا ہے کہ من و سلویٰ کے ذکر کے بعد صرف کلوا (کھاؤ) کا لفظ وارد ہوا ہے اس لیے کہ اس وقت تک بہتات کے ساتھ صرف غذا کا اہتمام فرمایا تھا۔ جب اسی بہتات اور فراوانی کے ساتھ پانی کا بھی انتظام فرما دیا تو کلوا کے ساتھ واشربوا (اور پیو) کا بھی اضافہ کر دیا۔

اجتماعیات و سیاسیات

مولانا سید جلال الدین صاحب العمری

اسلام کا شورائی نظام

(۳)

اہل حل وعقد کے اختیارات مذکورہ بالا سطور میں پیش کردہ تفصیل کے بعد اس حقیقت کے پانے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ اسلام کے نزدیک کتاب وسنت کے حدود میں عمومی اختیار پوری امت کو حاصل ہے اور نمائندگان امت درحقیقت اسی عمومی اختیار کے امین اور محافظ ہوتے ہیں ان کا یہ فرض منصبی ہوتا ہے کہ پوری امت کے جذبات ومیلانات کا حتمی طور پر پاس ولحاظ رکھیں اور ان کے رجحانات کے خلاف کوئی اقدام نہ کریں ورنہ ان کا حق نمائندگی ختم ہوجائے گا۔ دوسری طرف پوری امت کو ان کے سیرت وکردار پر اس قدر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ ان کے کسی فیصلہ کو بلا کسی معقول وجہ کے رد نہیں کردیتی۔ یہی نہیں بلکہ جب تک امت کے پاس کوئی قطعی دلیل عقلی یا نقلی نہ ہو وہ اس فہم وبصیرت رکھنے والے اور معاملات کا صحیح جائزہ لینے کی استعداد رکھنے والے طبقہ کی مخالفت نہیں کرسکتی۔ ایسی صورت میں امت پر واجب ہے کہ ارباب حل وعقد کے احکام کی بے چون وچرا پیروی کرے۔ فقہا کی اصطلاح میں جسے اجماع کیا جاتا ہے اس میں یہی ہوتا ہے کہ امت کے علماء کسی فیصلہ پر متحد ہوجاتے ہیں اور وہ فیصلہ ساری امت کے لیے واجب القبول ہوجاتا ہے۔

اسلام نے اس پہلو سے غایت درجہ حکمت ملحوظ رکھی ہے، آج کل عالم سیاسیات میں جو اختلافات ہنگامے اور عوام اور ارباب اقتدار کے درمیان جو دائمی کشمکش بپا رہتی ہے اس کے دفعیہ کی اس سے بہتر صورت

ممکن نہیں کہ ایک طرف عوام سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے میں سے قابل اعتماد اور باصلاحیت افراد کو اپنا نمائندہ مقرر کریں اور جن کی بے نفسی وحسن سیرت پر انھیں کامل بھروسہ ہو انھیں اپنا ترجمان سمجھیں۔ دوسری طرف ان سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ جس معاملہ پر یہ نمائندے متفق ہوجائیں جب تک تمہارے پاس کوئی برہان قاطع موجود نہ ہو ان کی بے لوثی اور اعلیٰ ترین صلاحیت پر بلاوجہ شک وشبہ نہ کرو اور ان کے فیصلوں کو قبول کرو۔

اس بحث کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو تین ارشادات کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ صدر اول میں اس کی کونسی تعبیر مراد لی گئی اور اس سلسلہ میں عملی پالیسی کیا رہی پھر یہ کہ بعد کے مستند علماء محققین نے اس کی کیا تشریح کی۔

عَنْ عَلِیٍّؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَوْ کُنْتُ مُؤَمِّرًا اَحَدًا مِنْ غَیْرِ مَشُوْرَۃِ الْمُؤْمِنِیْنَ لَاَمَّرْتُ ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ [1]

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو بغیر مشورہ کے امیر بناتا تو عبداللہ بن مسعود کو بناتا۔

یہ حدیث اس بحث میں فیصلہ کن اہمیت کی حامل ہے، نبیؐ کی رائے میں ایک شخص خلافت کا مستحق ہے لیکن وہ اپنی رائے کو اس لیے عملی جامہ نہیں پہناتا کہ اس سے شورائیت کے ختم ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اگر شورائیت ختم ہوگئی تو نظام اسلامی کا وہ ستون گر گیا جس کے بعد عمارت کے منہدم ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی۔

یہی وجہ ہے جس کی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو امت کا بہترین فرد اور خلافت کا سب سے زیادہ مستحق جاننے اور مرض الموت تک میں اس کی فکر رکھنے کے باوجود کبھی نامزد نہیں کیا۔

ایک مرتبہ آں حضرتؐ سے دریافت کیا گیا مَنْ یُؤَمَّرُ بَعْدَکَ ؟ آپ کے بعد کسے امیر بنایا جائے؟ آپ نے جواب دیا "اگر تم ابوبکر کو امیر بناؤ گے تو اسے دنیا سے بے نیاز اور آخرت کی طرف راغب پاؤ گے اگر عمر کو امیر بناؤ گے تو اسے ایک قوی ترین شخص امانت دار اور اللہ کے بارے میں کسی ملامت کی پروا نہ کرنے والا پاؤ گے، اور اگر تم علیؓ کو امیر بناؤ گے تو اسے ہدایت یافتہ ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والا پاؤ گے،

[1] مسند احمد حدیث نمبر ۵۶۶، ترمذی، حاکم، امام ترمذی نے اس حدیث پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا ہے لیکن دیگر طرق سے اس کی سند مضبوط ہے۔

وہ تمہیں صراط مستقیم پر لے چلے گا، لیکن میرا خیال ہے کہ تم اسے امیر نہیں بناؤ گے"[1]

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کا ذاتی رجحان خلافت کے سلسلہ میں مذکورہ بالا بزرگوں کی طرف تھا لیکن آپؐ نے انھیں خلیفہ نہیں مقرر کیا بلکہ صرف اپنی ذاتی رائے کے اظہار پر اکتفا کیا تاکہ شورائیت پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس قسم کے فیصلے امت کے ارباب حل وعقد ہی کیا کرتے تھے اور امت اسے بے چون وچرا قبول کر لیتی تھی۔

انتخاب خلیفہ ہی کا مسئلہ لیجئے۔ چاروں خلفاء کے انتخاب کی یہی صورت رہی ہے کہ امت کے ارباب بست وکشاد نے کسی کے انتخاب پر اتفاق کر لیا اور امت اس پر متفق ہوگئی لیکن جیسے کہ ہم نے کہا یہ طبقہ امت کے میلانات کو نظر انداز کر کے کسی کو خلیفہ نہیں منتخب کرتا تھا۔

علامہ ماوردیؒ انتخاب خلیفہ کی صورت اس طرح پیش کرتے ہیں :۔

فَإِذَا اجْتَمَعَ أَهْلُ الْعَقْدِ وَالْحَلِّ لِلْاِخْتِيَارِ تَصَفَّحُوا أَحْوَالَ أَهْلِ الْإِمَامَةِ الْمَوْجُودَةِ فِيهِمْ شُرُوطُهَا فَقَدَّمُوا لِلْبَيْعَةِ مِنْهُمْ أَكْثَرَهُمْ فَضْلًا وَأَكْمَلَهُمْ شُرُوطًا وَمَنْ يُسْرِعُ النَّاسُ إِلَى طَاعَتِهِ وَلَا يَتَوَقَّفُونَ عَنْ بَيْعَتِهِ فَإِذَا تَعَيَّنَ لَهُمْ مِنْ بَيْنِ الْجَمَاعَةِ مَنْ أَدَّاهُمُ الْاِجْتِهَادُ إِلَى اخْتِيَارِهِ عَرَضُوهَا عَلَيْهِ فَإِنْ أَجَابَ إِلَيْهَا بَايَعُوهُ عَلَيْهَا وَانْعَقَدَتْ بَيْعَتُهُ لَهُ فَلَزِمَ كَافَّةَ الْأُمَّةِ الدُّخُولُ فِي بَيْعَتِهِ وَالْاِنْقِيَادُ لِطَاعَتِهِ[2]

جب اہل حل وعقد امیر کے انتخاب کے لیے جمع ہوں گے تو ان اشخاص کے حالات پر غور کریں گے جن میں امامت کی شرطیں پائی جاتی ہیں اور وہ بیعت کے لیے اس شخص کو آگے بڑھائیں گے جو ان میں سب سے افضل ہو اور جس میں امامت کی شرائط بدرجۂ اتم پائی جاتی ہوں اور یہ کہ لوگ اس کی اطاعت کی طرف تیزگامی دکھائیں گے اور اس کی بیعت کے لیے پس وپیش نہیں کریں گے اور جب ان کی تحقیق واجتہاد ان میں سے کسی ایک کو چن لے تو منصب امامت اس شخص کے سامنے پیش کریں گے اور اگر وہ اسے قبول کر لے تو وہ سب اس کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور اس کی بیعت اس شخص کے لیے منعقد ہو جائے گی اور ساری امت کو اس بیعت میں داخل ہونا اور اس کی اطاعت قبول کرنا لازم ہو جائے گا۔

[1] مسند احمد حدیث نمبر ۹۰۸، طبرانی اوسط۔ بزار [2] احکام السلطانیہ ص۵

اس باڈی کو چونکہ پوری قوم کا اعتماد حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے ان کے فیصلہ کے بعد کسی شخص کو اس کے رد کا استحقاق نہیں رہتا اور ایسا شخص خارج عن الجماعۃ سمجھا جائے گا۔

مشہور محدث ابن بطال کہتے ہیں :۔

اَلْمُرَادُ بِالْجَمَاعَةِ أَهْلُ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ مِنْ كُلِّ عَصْرٍ[1]

"اَلْجَمَاعَة" سے مراد ہر دور کے اہل حل وعقد ہیں۔

محدث کرمانیؒ فرماتے ہیں :۔

مُقْتَضَى الْأَمْرِ بِلُزُومِ الْجَمَاعَةِ أَنَّهُ يَلْزَمُ الْمُكَلَّفَ مُتَابَعَةُ مَا أَجْمَعَ عَلَيْهِ الْمُجْتَهِدُونَ[2]

التزام جماعت کے حکم کا منشا یہ ہے کہ آدمی کو مجتہدین کے متفقہ فیصلہ کی اتباع کرنا لازمی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ کو اس بات کی شکایت ہے کہ لوگ "اجماع" کا مفہوم سمجھے بغیر غیر مجمع علیہ مسائل پر اجماع کا حکم صادر کر دیتے ہیں لیکن جب کسی مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو اس کی کیا حقیقت ہو جاتی ہے اسے خود امام موصوف کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

مَعْنَى الْإِجْمَاعِ أَنْ تَجْتَمِعَ عُلَمَاءُ الْمُسْلِمِينَ عَلَى حُكْمٍ مِنَ الْأَحْكَامِ لَمْ يَكُنْ لِأَحَدٍ أَنْ يَخْرُجَ عَنْ إِجْمَاعِهِمْ فَإِنَّ الْأُمَّةَ لَا تَجْتَمِعُ عَلَى ضَلَالَةٍ[3]

اجماع کا معنیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اہل علم کسی حکم پر متفق ہو جائیں اور جب کسی حکم پر امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ان کے اجماع سے باہر نکل جائے کیونکہ امت ضلالت پر مجتمع نہیں ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ جب اہل حل وعقد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تو آپ نے اسے پوری امت کی بیعت کے ہم معنیٰ تصور کیا اور امیر معاویہؓ کے اختلاف کو باغیانہ اختلاف سمجھ کر ان سے جنگ کی۔

حضرت عمرؓ کا ایک فرمان ہے "لَا خِلَافَةَ إِلَّا عَنْ مَشْوَرَةٍ"[4] خلافت مشورہ کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ایک مرتبہ فرماتے ہیں کہ تین باتیں ہیں جنھیں ذہن نشین کر لو ان میں سے ایک یہ "اَلْإِمَارَةُ شُورَى" امارت شوریٰ کے ذریعہ طے پائے گی۔[5]

[1] فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۴۵۔ [2] ایضاً [3] فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۱ ص ۲۰۲ [4] کنز العمال ج ۳ ص ۱۳۹
[5] کنز العمال ج ۳ ص ۱۵۸

حضرت عمرؓ اپنے ایک طویل خطاب میں فرماتے ہیں "اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ہاتھ پر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر بیعت کرے گا تو نہ اس کی بیعت کا کوئی اعتبار کیا جائے گا اور نہ اس شخص کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے جس کے ہاتھ پر بیعت کی گئی۔ ہاں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں دونوں کی گردنیں نہ اڑا دی جائیں"[1]

حضرت عمرؓ ہی کا ایک قول ہے:۔

مَنْ دَعَا اِلٰی اِمَارَۃِ نَفْسِہٖ اَوْ غَیْرِہٖ مِنْ غَیْرِ مَشْوَرَۃٍ فَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ لَّا تَقْتُلُوْہُ[2]

جو شخص اہل حل وعقد کے مشورہ کے بغیر خود امیر بننے یا دوسرے کو امیر بنانے کی دعوت دے تو تمہیں لامحالہ اسے قتل کر دینا چاہیے۔

حضرت عمرؓ نے اپنی وفات سے پہلے خلافت کے معاملہ کو جن چھ اشخاص کی کمیٹی کے حوالہ کیا تھا کہ باہمی مشورہ سے اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کر لیں، اس کمیٹی سے خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

فَمَنْ تَاَمَّرَ مِنْکُمْ عَلٰی غَیْرِ مَشْوَرَۃٍ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ فَاضْرِبُوْا عُنُقَہٗ[3]

تم میں سے جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر امیر بن جائے تو اس کی گردن قلم کر دو۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد جب لوگوں نے حضرت علیؓ کے سامنے خلافت کی پیشکش کی تو آپ نے جواب دیا، یہ کام رواروی اور جلد بازی میں طے کرنے کا نہیں ہے، حضرت عمرؓ کی متعین کردہ شوریٰ موجود ہے، وہ باہمی مشورہ سے کسی کو امیر منتخب کرے گی۔"[4]

ابن قتیبہ نے جو الفاظ نقل کیے ہیں وہ اور زیادہ صاف اور واضح ہیں۔

لَیْسَ ذٰلِکَ اِلَیْکُمْ اِنَّمَا ھُوَ لِاَھْلِ الشُّوْرٰی وَاَھْلِ بَدْرٍ فَمَنْ رَضِیَ بِہٖ اَھْلُ الشُّوْرٰی وَاَھْلُ بَدْرٍ فَھُوَ الْخَلِیْفَۃُ فَنَجْتَمِعُ وَنَنْظُرُ فِیْ ھٰذَا الْاَمْرِ[5]

انتخاب امیر تمہارا کام نہیں یہ اہل شوریٰ اور اہل بدر کا حق ہے جس شخص پر اہل شوریٰ اور اہل بدر متفق ہو جائیں گے وہی خلیفہ ہوگا پس ہم جمع ہوں گے اور اس معاملہ پر غور کریں گے۔

[1] بخاری باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت، مسند احمد حدیث نمبر ۳۹۱۔ [2] کنز العمال ج ۳ ص ۱۶۷۔ [3] طبقات ابن سعد القسم الاول ج ۳ ص ۲۴۹۔ ص ۲۵۱۔ [4] طبری ج ۵ ص ۱۵۶

اسی وقت حضرت زبیرؓ نے جو تقریر کی ہے اسے ابن قتیبہ نے ان الفاظ میں محفوظ کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ رَضِیَ لَکُمُ الشُّوْرٰی فَاَذْھَبَ بِہِ الْھَوٰی وَقَدْ تَشَاوَرْنَا وَرَضِیْنَا عَلِیًّا فَبَایِعُوْہُ[1]

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نظام شوریٰ پسند کیا ہے جس کے بعد کسی شخص کو اپنی خواہشات کی پیروی کا موقعہ نہیں رہا۔ ہم امامت کے معاملہ پر مشورہ کے بعد حضرت علیؓ پر متفق ہو گئے ہیں لہٰذا تم بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کرو۔

ان تصریحات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ امت کے اس اعلیٰ طبقہ کا اقتدار کتنا وسیع اور قوی ہے۔ شیخ محمد خضری لکھتے ہیں:۔

"شَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ" کا خطاب پوری امت سے ہے اسی وجہ سے مسلمانوں کے تمام اہم کاموں کی اساس شوریٰ ہی ہے۔ ان میں کا اہم ترین کام خلیفہ کا انتخاب ہے جو بغیر مسلمانوں کے مشورہ اور ان کی رضامندی کے عمل میں نہیں آسکتا۔ "شوریٰ" اہل حل وعقد کا دوسرا نام ہے جس میں کبار صحابہ رضوان اللہ علیہم شامل ہیں جنھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرف صحبت کے بیش از بیش مواقع فراہم ہوئے اور جنھیں نور بصیرت عطا کیا گیا تھا اور جو جانتے تھے کہ امت کی صلاح وفلاح کس کے انتخاب میں ہے۔"[2]

حضرت عمرؓ جب خلافت کو اپنے بعد چھ افراد کے حوالے کر چکے تو مشہور صحابی حضرت ابو طلحہ انصاریؓ کو بلا کر کہا کہ "تم اپنی قوم کے پچاس آدمیوں کو لے کر ان چھ افراد کو تین دن کے اندر اندر اپنے میں سے کسی ایک کو خلیفہ منتخب کرنے پر مجبور کر دو اور تین دن سے پہلے خلیفہ منتخب کیے بغیر انھیں چھوڑو نہیں۔"[3]

عراق کی مہم میں جس وقت حضرت ابو عبیدہ ثقفیؓ شہید ہو گئے تو کمانڈری کا معاملہ بڑا ہی اہم تھا چنانچہ حضرت عمرؓ نے صحابہ سے مشورہ کیا کچھ بزرگوں نے خود حضرت عمرؓ ہی کو کمانڈری جانے کا مشورہ دیا لیکن اکثریت اس رائے کے خلاف تھی اس وقت حضرت عمرؓ نے جو الفاظ ارشاد فرمائے ہیں وہ مسئلہ شوریٰ اور اہل حل وعقد کی حیثیت پر پوری طرح روشنی ڈالتے ہیں۔

یَحِقُّ لِلْمُسْلِمِیْنَ وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ وَاِنِّیْ اِنَّمَا کُنْتُ کَرَجُلٍ مِّنْکُمْ حَتّٰی صَرَفْتُمُوْنِیْ

مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ ان کے معاملات شوریٰ کے ذریعہ طے پائیں۔ میں تمہیں جیسا ایک فرد تھا جب تم نے

[1] الامامۃ والسیاسۃ ص ۴۲ [2] اتمام الوفاء فی سیرۃ الخلفاء ص ۱۲ [3] طبقات ابن سعد ج ۳ ص ۴۲

ذووا الرَّاْيِ مِنْكُمْ عَنِ الْخُرُوْجِ فَقَدْ رَاَیْتُ اَنْ اُقِیْمَ وَاَنْ اَبْعَثَ رَجُلًا[1]

اصحاب رائے نے مجھے میدانِ جنگ میں جانے سے روک دیا ہے تو میری یہ رائے قرار پائی کہ مدینہ میں مقیم رہوں اور کسی دوسرے آدمی کو مہم پر بھیجوں

اسی وجہ سے علماءِ امت نے شوریٰ کو دین کی ایک اہم بنیاد اور غیر متبدل اصول کی حیثیت دی ہے اور جو امیر اس اصلِ اساسی کو منہدم کرے تو اسے اپنے منصب سے ہٹا دیا جائے گا۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں :۔

وَالشُّوْرٰی مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِیْعَةِ وَعَزَائِمِ الْاَحْکَامِ مَنْ لَا یَسْتَشِیْرُ اَھْلَ الْعِلْمِ وَالدِّیْنِ فَعَزْلُہٗ وَاجِبٌ ھٰذَا مَا لَاخِلَافَ فِیْہِ[2]

حکم شوریٰ اساساتِ دین اور قطعی احکام میں سے ایک ہے جو حاکم اہلِ علم و دین سے مشورہ نہیں کرتا اس کا معزول کر دینا واجب ہے، یہ ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں پایا جاتا۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ جنین کی دیت کے سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا تھا۔ اس واقعہ پر بحث کرتے ہوئے آٹھویں صدی کے بلند پایہ محدث علامہ ابن دقیق العیدؒ لکھتے ہیں :۔

وَاسْتِشَارَةُ عُمَرَ فِیْ ذٰلِكَ اَصْلٌ فِی الْاِسْتِشَارَةِ فِی الْاَحْکَامِ اِذَا لَمْ تَکُنْ مَعْلُوْمَةً لِلْاِمَامِ[3]

حضرت عمرؓ کا اس معاملہ میں مشورہ کرنا ایک اصولی حیثیت رکھتا ہے جب کہ احکام امام کو معلوم نہ ہوں۔

علامہ رشید رضا مرحوم نے اس پہلو کو خوب واضح الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔

وَالظَّاھِرُ اَنَّ طَاعَتَھُمْ تَجِبُ عَلَی الْحُکُوْمَةِ وَاَفْرَادِ الْاُمَّةِ اِذَا ھُمْ اَجْمَعُوْا وَاَنَّہٗ یَجِبُ عَلَی الْحَاکِمِ وَالْمَحْکُوْمِ رَدُّ الْمَسَائِلِ الْعَامَّةِ وَالْمُتَنَازَعِ فِیْھَا اِلَیْھِمْ سَوَاءٌ اجْتَمَعُوْا بِاَنْفُسِھِمْ اَوْ بِطَلَبِ الْاُمَّةِ

واضح بات تو یہ ہے کہ اولوالامرؒ کی اطاعت حکومت اور افرادِ امت دونوں پر واجب ہے جب وہ کسی بات پر متفق ہو جائیں اور امیرِ مملکت اور افرادِ امت پر واجب ہے کہ وہ مختلف فیہ امور اور عام مسائل میں ان کی طرف رجوع کریں یہ اولوالامر خواہ از خود جمع ہو گئے ہوں یا امت کے

[1] الفاروق شبلی ج ۲ ص ۲۰۹ ۔ [2] تفسیر قرطبی ج ۴ ص ۹۵ [3] احکام الاحکام ج ۲ ص ۹۸

اَوْ بِطَلَبِ الْحُکُوْمَةِ بِشَرْطِ اَنْ یَّکُوْنُوْا ھُمْ ھُمْ[1]

طلب کرنے یا حکومت کی طلب سے مجتمع ہو گئے ہوں بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں اہلِ حل و عقد ہوں۔

روزمرہ کے معاملات میں مشورہ ضروری نہیں ہے

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا روزمرہ معاملات میں بھی مشورہ ضروری ہے؟ اور یہ کہ مشورہ لینے کے بعد شوریٰ کی رائے کی پابندی بھی ضروری کرنی چاہیے؟ اس کا جواب ہم گذشتہ اوراق میں اشارۃً دے چکے ہیں، یہاں ہم کسی قدر تفصیل سے کلام کرنا چاہتے ہیں۔

صدرِ اول میں اربابِ حل و عقد ایسے ہی معاملات میں مجتمع ہوتے تھے جو امت کے حق میں فیصلہ کن اور حد درجہ نزاکت کے حامل ہوتے تھے یہ پورا طبقہ چونکہ امت کا نمائندہ ہوتا تھا، اس لیے اس کی اطاعت بھی امیر پر واجب ہوتی تھی لیکن روزمرہ کے مسائل میں یہ طبقہ شریک نہیں ہو سکتا تھا۔ خلیفہ زیرِ بحث مسئلہ میں جسے اہل تر سمجھتا اس سے مشورہ کر لیتا اور اس مشورہ کی پابندی اس پر لازمی بھی نہیں ہوتی تھی۔ شریعت نے گو ایسے معاملات میں مشورہ کرنے کو حد درجہ مستحسن قرار دیا ہے اور ان کے مشورہ سے بلاوجہ انحراف کو ناپسند کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان معاملات میں امیر و قاضی کو اپنے اجتہاد سے کام کرنے کا حق بھی عطا کیا ہے۔ اس قسم کے تعامل کے نمونے ہم آئندہ چل کر پیش کریں گے یہاں صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور اکابر امت کی تصریحات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ لَمَّا اَرَادَ اَنْ یَّبْعَثَ مُعَاذًا اِلَی الْیَمَنِ قَالَ کَیْفَ تَقْضِیْ اِذَا عَرَضَ لَكَ قَضَاءٌ؟ قَالَ اَقْضِیْ بِکِتَابِ اللّٰہِ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ قَالَ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰہِ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدْ فِیْ سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰہِ وَلَا فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ قَالَ اَجْتَھِدُ رَاْیِیْ وَلَا اٰلُوْ فَضَرَبَ رَسُوْلُ

جس وقت حضرت معاذؓ کو رسول اللہؐ نے یمن بھیجا تو دریافت کیا جب کوئی مقدمہ پیش ہو تو فیصلہ کس طرح کرو گے جواب دیا کتاب اللہ کے مطابق، پھر آنحضرتؐ نے سوال کیا اگر اللہ کی کتاب میں کوئی حل نہ ملے تو کیا کرو گے؟ جواب دیا سنتِ رسول کے مطابق فیصلہ کروں گا اس کے بعد آنحضرت نے دریافت کیا کہ اگر کتاب و سنت دونوں میں کوئی واضح راہنمائی نہ ملے تو کیا

[1] تفسیر المنار ج ۵ ص ۲۰۰

اللّٰہِ صَدْرَہٗ فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ لِمَا یَرْضٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ[1]

طریقہ اختیار کروگے؟ حضرت معاذؓ نے کہا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور راہ صواب پانے میں اپنی سی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھوں گا۔ حضورؐ نے مسرت سے ان کے سینہ پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے قاصد کو رسولِ خدا کی مرضی کے مطابق ہدایت عطا کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ قاضی شریحؒ کو لکھتے ہیں :۔

"اگر کوئی ایسا مسئلہ پیش آجائے جس کے بارے میں کتاب، سنت اور ائمہؒ صالحین کے فیصلوں سے کوئی واضح ہدایت نہ ملتی ہو تو تم خود بھی اجتہاد کر سکتے ہو اور مجھ سے مشورہ بھی کر سکتے ہو۔ مجھ سے مشورہ کرنا تمہارے حق میں بہتر ہی ہوگا[2]۔"

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں :

"قاضی کے اندر پانچ اوصاف پائے جانے چاہئیں ان میں سے ایک کا بھی فقدان ایک نقص ہے۔ وہ گذشتہ مقدمات کا عالم، اہل الرائے سے مشورہ کرنے والا، خصم کے مقابلہ میں حلیم، ملامت گروں کی ملامت کو انگیز کرنے والا ہو[3]۔"

مالیات کا ذمہ دار کن صفات کا حامل ہونا چاہیے، اس کی تشریح امام ابو یوسفؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

فَلْیَکُنْ فَقِیْھًا عَالِمًا مُشَاوِرًا لِاَھْلِ الرَّاْیِ عَفِیْفًا[4]

چاہیے کہ وہ فقیہ ہو، عالم ہو، اہل الرائے سے مشورہ کرنے والا ہو اور ناجائز امور سے پرہیز کرنے والا ہو۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں :۔

---

[1] ابوداؤد کتاب القضاء باب اجتہاد الرائی فی القضاء۔ ترمذی ابواب الاحکام باب ماجاء کیف یقضی القاضی؟ اس حدیث کی سند غیر متصل ہونے کی وجہ سے امام ترمذی نے اس کی صحت پر شبہ کیا ہے۔ امام ابن قیمؒ نے ایک لطیف بحث کے ذریعہ اس کی صحت ثابت کی ہے اعلام الموقعین ج ۱ صفحہ ۱۷۵، ۱۷۶ [2] نسائی کتاب القضاء باب الحکم باتفاق اہل العلم بیہقی ج ۱۰ صفحہ ۱۱۰ [3] رواہ البخاری موقوفاً کتاب الاحکام باب متی یستوجب القضاء والبیہقی مرفوعاً ج ۱۰ صفحہ ۱۱۱۔ [4] کتاب الخراج صفحہ ۱۲۷

اِذَا نَزَلَ بِالْحَاکِمِ الْاَمْرُ یَحْتَمِلُ وُجُوْھًا اَوْ مُشْکِلٌ یَنْبَغِیْ لَہٗ اَنْ یُّشَاوِرَ[1]

جب حاکم کے سامنے کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جو مختلف پہلو اپنے اندر رکھتا ہو یا کوئی مشکل پیدا ہو تو اسے مشیروں سے مشورہ کرنا چاہیے۔

علامہ علاء الدین کاشانی حنفی المتوفی ۵۸۷ھ فرماتے ہیں۔

اَنْ یَّجْلِسَ مَعَہٗ جَمَاعَۃٌ مِّنْ اَھْلِ الْفِقْہِ یُشَاوِرُھُمْ وَیَسْتَعِیْنُ بِرَاْیِھِمْ فِیْمَا یَجْھَلُہٗ مِنَ الْاَحْکَامِ[2]

قاضی کے ساتھ (مجلس عدالت) میں اہل فقہ کی ایک جماعت بیٹھے جس سے وہ ان احکام میں جنھیں وہ نہیں جانتا ہے مشورہ کرے اور ان کی رایوں سے مدد لے۔

مشیروں کی ذمہ داریاں اسلام نے ایک طرف عام افراد سے لے کر کار پردازانِ حکومت تک کو مشورہ کرنے اور اسے قبول کرنے کا حکم دیا ہے دوسری طرف اس نے مشیروں کو ان کی نازک ذمہ داریوں سے بھی آگاہ کیا ہے کہ ایک شخص تمہاری صداقت و امانت پر اعتماد کرتا ہے، مسائل کی تیرگیوں میں تمھیں مشعلِ راہ سمجھتا ہے، اگر تم نے اسے راہ صواب دکھانے کے بجائے ظلمتوں بھرے جنگل میں لاکر چھوڑ دیا تو تم نے انسانیت کا خون کردیا، اپنے ایمان و اسلام اور تقویٰ و طہارت کو پامال کردیا اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں سے سراسر خسران و نامرادی کی متاع خریدی کیونکہ یہ صلاحیتیں تمہارے اندر خیر خواہی اور غم خواری کے لیے پیدا کی گئی تھیں۔

اس مقصد کے لیے اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر نصح اور خیر خواہی کی جلوہ گری دیکھنا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ معاشرہ درندوں اور وحشیوں کا بھٹ بننے کے بجائے اخوت و راحت، دل سوزی و غم خواری کا منبع بن جائے جہاں سے خیر و خوبی کے چشمے پھوٹنے لگیں اور ہر فرد دوسرے فرد کو اپنا بھائی اپنا شریکِ رنج و راحت اور اپنا رازداں و خیر خواہ سمجھنے لگے۔

لیکن یہ وہ خیر خواہی نہیں جس میں ایک انسان اندھی عصبیت کے تحت دوسرے کی حمایت پر کمربستہ ہو جاتا ہے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل، بلکہ یہ وہ خیر خواہی ہے جو اشخاص سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق اصول سے ہوتا ہے۔ ایک مومن جب کسی کو حق پر دیکھے گا تو اس کی ساری توانائیاں حق اور دعوتِ حق کی حمایت میں مصروف ہو جائیں گی چاہے وہ اس کا عزیز ہو یا کوئی اجنبی، اس کا رنگ سفید ہو یا سیاہ، وہ اس کے

---

[1] کتاب الام ج ۷ صفحہ ۸۶ ، [2] بدائع الصنائع ج ۷ صفحہ ۱۱-۱۲

حدودِ جغرافیہ کے اندر رہتا ہو یا باہر۔

اس کے برعکس جب وہ اپنے بھائی کے اندر کوئی نقص یا عیب دیکھے گا یا اسے حق کے بجائے باطل کی راہ پر گامزن پائے گا تو اس کی صلاحیتوں کا ایک ذرہ بھی باطل کے تعاون میں صرف نہیں ہوگا، ہاں وہ اپنے بھائی کو باطل کی تباہیوں اور نامرادیوں سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکنہ سعی کرے گا۔

تمیم داریؓ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرمایا "دین خیر خواہی کا نام ہے" صحابہؓ نے دریافت کیا "خیر خواہی کس کے ساتھ کی جائے؟" آپؐ نے جواب دیا "اللہ کے ساتھ، اللہ کی کتاب کے ساتھ، اللہ کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے رہنماؤں اور عام مسلمانوں کے ساتھ"[۱]

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا "اپنا بھائی خواہ ظالم ہو یا مظلوم اس کی مدد کرو" صحابہؓ نے دریافت کیا "مظلوم کی مدد تو ہو سکتی ہے، ظالم کی مدد کیسے کی جائے؟" آپؐ نے جواب دیا "ظالم کا ہاتھ پکڑلو اور اسے ظلم سے باز رکھو"[۲]

اس سے آگے بڑھ کر اسلام ایک اور حقیقت ذہن نشین کراتا ہے وہ یہ کہ دوسروں کی بھلائی اور خیر خواہی سے خود تمہارا بھلا ہے۔ دوسروں کو صحیح راہ دکھاتے ہو تو اس سے خود ہی اپنے لیے فلاحِ آخرت اور ثوابِ حقیقی کا ذخیرہ جمع کرتے ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے :—

مَنْ دَلَّ عَلٰی خَیْرٍ فَلَہٗ مِثْلُ اَجْرِ فَاعِلِہٖ[۳] — جو شخص کسی بھلائی کی طرف راہنمائی کرے تو اسے بھلائی کرنے والے جیسا ثواب ملے گا۔

ان عمومات سے اندازہ لگائیے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے اندر کس قسم کی روح پیدا کرنا چاہتا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ اس کے نام لیوا اس قدر نیک سیرت اور پیکرِ حسنِ عمل ہوں کہ اپنے معاشرہ میں کسی گندہ عمل اور ناپاک کردار کو پنپنے نہ دیں اور جیسے ہی یہ افعی اپنا سر اٹھائے اس کا سر کچل کر رکھ دیا جائے۔

ایک مومن جس طرح کسی فرد کے اندر بدی کی حکمرانی نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح جبینِ حکومت اور اربابِ بست و کشاد کے چہروں پر بھی بدعملی کے داغ دھبے برداشت نہیں کر سکتا، اس کا فرض ہے کہ ہر گمراہ کو راہِ صواب دکھائے اور ہر طالبِ خیر کو خیر کی طرف راہنمائی کرے۔ جس طرح روئی کے گالے اور آگ کا شعلہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اسی

[۱] صحیح مسلم، ابو داؤد کتاب الآداب باب فی النصیحۃ [۲] بخاری ابواب المظالم والقصاص باب اعن اخاک ظالماً او مظلوماً۔ [۳] ابو داؤد کتاب الآداب باب فی الدال علی الخیر۔

طرح مومن اور بدخواہی کا بھی اتحاد ناممکن ہے۔ یہ اصول اپنے عموم میں جس طرح افراد کو لیے ہوئے ہے اسی طرح اپنی وسعت میں حکومت کے ایوانوں پر بھی حاوی ہے۔ ایک وہ شخص جو کسی فرد کی تباہی نہ دیکھ سکتا ہو کیا اس کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ قوموں کی تباہی کو ٹھنڈی آنکھوں سے دیکھے گا؟

ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "تباہی اور خسران ہے اس دھوکہ باز کے لیے"۔ صحابہ نے سوال کیا کہ آپ کس قسم کے فریب دہندہ کو مراد لے رہے ہیں؟ حضورؐ نے جواب دیا "میرا روئے کلام اس مکار کی طرف ہے کہ جس کے سفلہ پن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب امیر سچ کہتا ہے تو بھی یہ اس کی تصدیق کرتا ہے اور دروغ بافی سے کام لیتا ہے تو بھی اس کی جی حضوریاں اس کا ساتھ دیتی ہیں"[۱]

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کعب بن عجرہؓ سے کہا "خدا تمہیں بے وقوفوں کے دورِ امارت کے شر سے محفوظ رکھے"۔ کعب نے پوچھا "بے وقوفوں کی امارت سے آپ کی کیا منشا ہے؟" آپؐ نے جواب دیا، "میرے بعد ایسے لوگوں کے ہاتھ میں بھی زمامِ اقتدار آئے گی جو میرے طریقے کی اتباع نہیں کریں گے اور میری بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر گامزن نہیں ہوں گے جو شخص ان کی غلط روی کی تائید کرے گا اور ان کے ظلم میں ان کا ہاتھ بٹائے گا ایسے شخص کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ قیامت کے دن میرے حوض پر حاضر ہو سکے گا لیکن جو شخص ان کے جھوٹ کی تصدیق نہیں کرے گا اور ان کی جابرانہ روش میں ان کا دست و بازو نہیں بنے گا تو ایسے شخص کا تعلق مجھ سے ہے اور میرا اس سے اور وہ قیامت کے دن میرے حوض پر آسکے گا"[۲]

بعض اوقات آپ نے ظالم کے ظلم کا ساتھ دینے پر اس سے بھی زیادہ پرہول وعیدیں سنائی ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا :—

مَنْ اَعَانَ ظَالِمًا عَلٰی ظُلْمِہٖ جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ وَعَلٰی جَبْھَتِہٖ مَکْتُوْبٌ آیِسٌ مِنْ رَحْمَۃِ اللّٰہِ[۳] — جس نے کسی ظالم کی اس کے ظلم میں مدد کی تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی پیشانی پر— مایوس رحمتِ الٰہی— لکھا ہوا ہوگا۔

ایک اور حدیث ہے :—

مَنْ مَشٰی مَعَ ظَالِمٍ لِیُعِیْنَہٗ وَھُوَ یَعْلَمُ — جو شخص ظالم کی دیدہ و دانستہ مدد کے لیے قدم اٹھائے تو وہ

[۱] حدیث میں لفظ "الذربہ" ہے جو شکاری کی کمین گاہ کو کہتے ہیں۔ [۲] کنز العمال ج ۳ ص ۱۶۷ [۳] مستدرک حاکم ج ۱ ص ۸۵ رواہ الترمذی والنسائی مع اختلاف یسیر۔ [۴] کنز العمال ج ۳ ص ۱۶۵

اَنَّہٗ ظَالِمٌ فَقَدْ خَرَجَ مِنَ الْاِسْلَامِ۔ — اسلام سے خارج ہو گیا۔

ان وعیدوں کے جاننے کے بعد ایک مسلمان جس کے دل میں ذرہ برابر خوفِ خدا اور محاسبۂ آخرت کا یقین ہو کیا وہ اس مشنری کا کل پرزہ بن سکے گا جس میں شب و روز حق کو چھپایا جاتا ہو جہاں صدق و صفا اور عدل و انصاف کے حلقوم پر چھری پھیری جاتی ہو جہاں جور و جفا اور معصیت کی وجہ سے زمین و آسمان کی وسعتیں تنگ ہو گئی ہوں؟ اور اگر کوئی شخص اپنے دعوائے ایمان کے باوجود یہ روش اختیار کرتا ہے تو وہ کتمانِ حق کا مجرم ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ — اس شخص سے زیادہ کون ظالم ہے جس نے اپنے پاس اللہ کی شہادت رکھتے ہوئے بھی اسے چھپا دیا۔

اس آیت میں حق کے دیدہ و دانستہ چھپانے کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا گیا ہے اور یہ آیت اپنے عموم میں ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن میں کتمانِ حق ہوتا ہو۔ حق کے زوال اور بربادی کی پُر سکوت داد دی جائے یا صحیح رہنمائی کے موقف میں ہونے کے باوجود کلمۂ حق کہنے سے پس و پیش کیا جائے یا اور کوئی صورت ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَائِرٍ — بہترین جہاد جابر حاکم کے روبرو کلمۂ حق کا اظہار ہے۔

آپ کا ایک اور فرمان ہے:۔

مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ ثُمَّ كَتَمَهٗ اُلْجِمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِلِجَامٍ مِنَ النَّارِ۔ — جس شخص سے کسی ایسے علم کی بابت دریافت کیا جائے جسے وہ جانتا ہے پھر وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔

ان تصریحات سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کیا ایک مسلم مشیر و وزیر مسلمان رہتے ہوئے پرستارِ جاہ و منصب، زمانہ ساز اور ریا کا ساتھی ہو بھی سکتا ہے؟ کیا چاپلوسی اور کاسہ لیسی اس کی پاکیزہ فطرت سے میل کھا سکتی ہے؟ کیا اس کے نزدیک اقتدار کی مرضی و نامرضی اور حاکم کی چشم و ابرو کے اشارے معیارِ حق بن سکتے ہیں یا خدا کی نازل کردہ ہدایت؟

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشیروں کو ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہوئے فرمایا "اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ" جس سے مشورہ لیا جاتا ہے وہ امین ہوتا ہے" اس کا فرض ہے کہ امانت کو بلا کم و کاست جوں کی توں طالبِ مشورہ کے حوالہ کرے۔ غور کیجیے اگر کسی مشیر کے اندر یہ تصور جاگزیں ہو جائے تو وہ کسی کو گمراہ کن اور غلط مشورہ دے سکتا ہے؟

(باقی صفحہ پر)

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

خانہ کعبہ کی اہمیت کے اسباب

(۴)

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (البقرہ ۱۵۸، ۱۵۹)

بےشک صفا اور مروہ خدا کی یادگاروں میں سے ہیں پس جو خانۂ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے تو اس کے لیے اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ان کا طواف کرے اور جو بطیبِ خاطر کوئی بھلائی کرے تو اللہ تعالیٰ قبول کرنے اور جاننے والا ہے۔ بلاشبہ جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی روشن باتوں اور ہدایتوں کو اس کے بعد کہ ہم نے لوگوں کے لیے اسے کتاب میں واضح کر دیا تھا چھپاتے ہیں ان پر اللہ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت پڑتی ہے۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مروہ خدا کی یادگار[1] ہے اس لیے کہ یہاں قربانی کا واقعہ پیش آیا تھا اور اسی لیے اس کے طواف کا حکم دیا گیا ہے اور یہود نے واضح ثبوت اور روشن ہدایات کے باوجود اس حقیقت کو مخفی رکھنے کی ناکام سعی و کوشش کی اس لیے وہ غضبِ الٰہی کے مورد ہوئے۔

[1] راقم الحروف نے اپنے ایک مضمون میں جو اسی آیت کے متعلق معارف اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے مروہ کے شعائرِ الٰہی میں ہونے کا اصل سبب بیان کیا ہے (ض)

یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر مروہ ہی مقام ذبح تھا تو پھر منیٰ میں قربانی کرنے کی وجہ کیا ہے اور صفا و مروہ کے درمیان صرف سعی و طواف پر کیوں اکتفا کیا جاتا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اصل میں قربان گاہ تو مروہ ہی ہے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ

هٰذَا الْمَنْحَرُ وَكُلُّ فِجَاجِ مَكَّةَ مَنْحَرٌ وَطُرُقُهَا مَنْحَرٌ (موطا)

یہی اصل قربانی کی جگہ ہے اور مکہ کی ہر گلی، کوچہ بھی جائے قربانی ہے۔

اور منیٰ کے متعلق بھی آپ نے فرمایا :-

هُوَ مَنْحَرٌ

منیٰ بھی قربانی کی جگہ ہے۔

آپ کے الفاظ پر غور کیجیے کہ مروہ کے متعلق تو "اَلْمَنْحَرُ" یعنی اصل قربان گاہ ہے کہا اور منیٰ اور دوسرے مقامات کی نسبت "مَنْحَرٌ" یعنی یہ سب بھی قربانی کی جگہیں ہیں فرمایا، اس کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ قربانی کے جانوروں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :-

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ (حج ۳۳)

پھر انھیں قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

اور دوسری جگہ ہے :-

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ (مائدہ ۹۵)

قربانی کے جانوروں کو کعبہ کے پاس لے جانا ہے۔

یہ اس لیے کہ ان کے ذبح ہونے کی جگہ بیت اللہ کے پہلو میں ہے اور یہ بالکل واضح ہے کہ مروہ بیت اللہ کے پہلو میں واقع ہے اور وہی اصل قربان گاہ ہے اور منیٰ وہاں سے تین میل کے فاصلہ پر ہے لیکن جب امت کا دائرہ وسیع ہوا اور مروہ کے پاس تنگی کی وجہ سے قربانی کرنا ممکن نہ رہا تو قربان گاہ میں بھی وسعت ہو گئی اور منیٰ چونکہ میدان ہے اسی لیے وہ اس کے لیے زیادہ انسب اور موزوں قرار پایا البتہ مروہ کا طواف ضروری اور لازمی قرار دیا گیا تاکہ اس عظیم بالشان واقعہ کی یادگار ہمیشہ تازہ اور باقی رہے اور حج کرنے والوں کے ذہن سے صبر و تسلیم اور اطاعت و فرمانبرداری کا یہ عدیم المثال کارنامہ اوجھل نہ ہونے پائے۔

غرض خانہ کعبہ کا موضع قربانی ہونا اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی مزید بحث و تحقیق کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ اس کے متعلق مدلل بحث و تفصیل دیکھنا چاہیں انھیں مولانا حمید الدین صاحب فراہیؒ کے رسالہ الرأی الصحیح

فیمن ہو الذبیح کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۷۔ خانہ کعبہ پوری امت کی عالمگیر اجتماع گاہ اور مقام زیارت ہے اسی لیے ہر مسلمان بشرطیکہ وہ استطاعت رکھتا ہو اپنی عمر میں ایک بار ضرور یہاں آکر اس گھر کے ارد گرد چکر لگاتا ہے اور اس کی زیارت اور حج کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو اس گھر کے قریب جوار میں بسانے کا ایک مقصد یہ بیان کیا ہے کہ وہ حج کا اعلانِ عام کریں اور لوگ دور دراز کے گوشوں سے یہاں آکر مقدس مقامات کی زیارت کریں اور اس گھر کا حج و طواف کریں۔ چنانچہ فرمایا :—

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَلَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَعْلُومَاتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُمْ مِنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۔

(حج ۲۶ تا ۲۹)

اور یاد کرو! جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کے پاس آباد کیا اور حکم دیا کہ میرا کسی کو ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور میری عبادت میں کھڑے ہونے والوں اور رکوع و سجدہ کرنے والوں، (یعنی نماز پڑھنے والوں کے) لیے پاک رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کرنا تاکہ وہ تمہارے پاس پیادہ اور لاغر اونٹوں پر گہرے راستوں سے آئیں تاکہ اپنے فوائد کو دیکھیں اور اللہ کا نام لیں چند متعین دنوں میں ان چوپایوں پر جو اللہ نے انھیں روزی کیے ہیں پس ان میں سے خود کھاؤ اور تنگ حال فقیر کو کھلاؤ۔ پھر اپنا میل کچیل ختم کرو اور اپنی نذریں پوری کرو اور قدیم گھر کا طواف کرو۔

حضرت ابراہیمؑ نے بھی اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ لوگوں کے دلوں کو اس کی طرف اس طرح مائل کر دے کہ وہ ذوق و شوق اور والہانہ جذبات کے ساتھ اس گھر کے پاس آئیں (فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ) اور اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو بڑی شدت اور تاکید کے ساتھ اس گھر کے طواف اور حج کا حکم دیا ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا وَمَنْ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (آل عمران)

اللہ کے لیے لوگوں پر حج بیت اللہ لازمی ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہوں اور جس نے انکار کیا تو اللہ دنیا والوں سے بے نیاز اور بے پروا ہے۔

دیکھو اس آیت میں حج نہ کرنے اور اس عالمگیر اجتماع میں شریک نہ ہونے کو کفر و انکار کے ہم معنی قرار دیا گیا ہے اور اس کی تشریح ترمذی شریف کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔

عَنْ عَلِیٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ مَلَکَ زَادًا وَّرَاحِلَۃً تُبَلِّغُہٗ اِلٰی بَیْتِ اللّٰہِ وَلَمْ یَحُجَّ فَلَا عَلَیْہِ اَنْ یَّمُوْتَ یَھُوْدِیًّا اَوْ نَصْرَانِیًّا اِنَّ اللّٰہَ یَقُوْلُ فِیْ کِتَابِہٖ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص زادِ راہ اور بیت اللہ تک پہنچانے والی سواری کی وسعت رکھنے کے باوجود حج نہ کرے تو چاہیے اس کی موت یہودیت پر ہو یا نصرانیت پر۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ الخ

اسی طرح دوسری روایتوں میں بھی حج و زیارت کے بکثرت فضائل بیان ہوئے ہیں مثلاً ایک روایت میں ہے کہ حجِ مبرور کا صلہ جنت ہے (مسلم و ترمذی) اور حج کرنے والا اگر فسق و فجور میں نہ ملوث ہو تو وہ گناہوں سے اس بچہ کی طرح پاک ہو جاتا ہے جو ابھی ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔ (ترمذی)

اس تفصیل سے دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ بیت اللہ جس طرح تمام امت کا قبلہ اور مرکز ہے اسی طرح اجتماع گاہ بھی ہے اور ہر استطاعت رکھنے والے مسلمان کو عمر بھر میں کم از کم ایک بار اس میں شریک ہونا لازمی ہے، چاہے وہ دنیا کے کسی گوشہ میں آباد ہو، کسی ملک قوم اور نسل و رنگ سے اس کا علاقہ ہو، کسی تہذیب و معاشرت اور رنگ و روپ میں ہو، کوئی زبان بھی بولتا ہو، کیسا ہی لباس پہنتا ہو اور کسی برادری سے بھی تعلق رکھتا ہو لیکن اگر مسلمان ہے، ملت ابراہیمی سے اس کا رابطہ ہے اور اس گھر کی حرمت و عزت اور اس کی مرکزیت پر ایمان و اذعان رکھتا ہے تو اسے اسی طرح کے اپنے تمام طبعی امتیازات اور فطری اختلافات کو نظر انداز کر کے اس گھر کا حج و طواف کرنا ضروری ہے تاکہ اس کی برکتوں اور نعمتوں سے مالا مال ہو اور دینِ حق

کی اصل حقیقت اس کے سامنے آجائے۔ ہمارا یہی ذوق و شوق ہے جس کا اظہار اس سے دور رہتے ہوئے ہم اس طرح کرتے ہیں کہ اپنی نمازوں میں اس گھر کی طرف رُخ کرتے ہیں اور قربانی کا جانور ذبح کرتے ہوئے اسے قبلہ رُخ لٹا دیتے ہیں تاکہ دوری میں بھی اس کے ساتھ ہمارا تعلق باقی رہے۔

اس اجتماع میں شریک ہونے سے متعدد دینی و دنیاوی اور روحانی و مادی فائدے حاصل ہوتے ہیں مثلاً دینِ حق اور خدا پرستی کی اصل حقیقت ذہن میں رچ بس جاتی ہے اور ہمارے سامنے اصل ایمان، حقیقی اسلام اور ملت ابراہیمی کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ عشق و محبت الٰہی کا وہ جوش و جذبہ جو ابراہیمؑ کے سینہ میں تھا اور اطاعت کیشی اور فدویت و جاں نثاری کا وہ ولولہ اور شوق جو اسماعیلؑ کے دل میں کارفرما تھا کچھ نہ کچھ اس کی گرمی ہمارے اندر بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ حق پرستی اور اس کی راہ میں قربان ہو جانے کا حوصلہ بڑھتا ہے اور دعوت توحید کا احساس ابھرتا ہے۔

اگر اس اجتماع کی صحیح روح ہم سمجھیں تو اس سے ہماری تنظیم اور جماعتی شیرازہ بندی ہوگی، اتفاق و اتحاد ہم آہنگی اور یک رنگی پیدا ہوگی۔ ایک جگہ اکٹھا ہونے سے ایک مرکز خیال اور ایک نقطۂ نگاہ پر جمع ہونے کی توفیق ملے گی۔ قومیت اور وطنیت کے گھناؤنے اور مذموم جذبات نے آج دنیا کو تباہ و غارت کر کے رکھ دیا ہے لیکن اس اجتماع میں شریک ہونے والے چاہے کسی قوم و وطن سے تعلق رکھتے ہوں سب ایک ملت اور قوم کی حیثیت میں نمایاں ہوتے ہیں، جغرافیائی حدود، لسانی اور طبقاتی اختلافات، رنگ اور روپ، خون اور نسل کی تفریقات اور اسی طرح کے دوسرے تمام امتیازات اور اختلافات یکسر ختم ہو سکتے ہیں۔ یہاں سب بھائی بھائی نظر آتے ہیں۔ ہر ایک کا طور طریقہ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے۔ سب ایک ہی قسم کا کپڑا زیب تن کیے ہوئے دوش بدوش ایک ہی دھن اور ایک ہی لَے میں سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ اس سے ہمہ گیر وحدت اور عالمگیر بھائی چارگی کی بنیاد پڑ سکتی ہے اور جنگ و جدال کے تمام اسباب اور فتنہ و فساد کی ساری راہیں مسدود ہو سکتی ہیں۔

ایک جگہ جمع ہو کر دوسرے کی مشکلات اور پریشانیوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوتا ہے۔ باہم ہمدردی، مواسات، غربا پروری اور مسکین نوازی کا جذبہ اور محبت و مودت کا رشتہ استوار ہوتا ہے،

کیونکہ بیت اللہ توحید کی طرح ہمدردی و مواسات اور غربا پروری کا بھی مرکز ہے۔

یہاں تمام پیچیدہ، دشوار اور نازک مسئلے حل ہو سکتے ہیں اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی مختلف تجویزوں اور اسکیموں پر غور کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام حکومت اور خلافت کے زمانہ میں حج سیاسی اور تنظیمی امور کا ایک اہم وسیلہ بن گیا تھا، خلیفہ کے سامنے تمام والیانِ ریاست اور حکام دقیق اور الجھے ہوئے مسائل میں مشورہ اور استصواب کر کے ان کا حل معلوم کرتے اور یہیں اہم امور بھی طے پاتے تھے۔

اجتماع حج کو دین کی تبلیغ و دعوت اور اس کی نشر و اشاعت کا بھی بہترین واسطہ بنایا جا سکتا ہے۔ جملہ احکام و شرائع اور عبادات و معاملات سے متعلق بے شمار مسائل جن سے عوام عموماً بے خبر ہوتے ہیں سب ایک خاص انتظام و اہتمام کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں۔ مختلف الخیال اہل علم اور اصحاب کمال اکٹھا ہو کر مختلف سیاسی، ملی، قومی، اجتماعی، تمدنی، علمی اور ثقافتی مسائل پر تبادلۂ خیالات کر کے ایک دوسرے کی معلومات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سیر و سیاحت کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ مقدس اور بابرکت سفر اس کا مزید شوق و ذوق پیدا کرتا ہے اور مسلمانوں میں بہت سارے لوگ جنھوں نے جغرافیہ اور سفرنامے کی معلومات آفریں کتابیں لکھیں ان کا شوقِ سیر و سیاحت بھی اسی مقدس گھر کے فیض و برکت کا نتیجہ ہے۔

یہ اور اسی طرح کے نہ جانے کتنے فائدے ہیں جو اس عظیم اجتماع گاہ سے حاصل ہو سکتے ہیں، لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں کو یہ تمام مواقع بسہولت میسر ہیں لیکن پھر بھی ان کی قسمت اور تقدیر کا ستارہ گردشِ روزگار کا شکار ہے اور ذلت و نکبت کی تمام قسمیں ان کے دامن سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہیں۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

۸۔ خانۂ کعبہ کی عظمت و برتری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ پیغمبر آخر الزماں یہیں مبعوث ہوئے اور آپ کی دعوتِ توحید کا آغاز بھی اسی سرزمین سے ہوا۔ یہ گھر ایک ویرانہ میں آباد اور ایک عرصۂ دراز تک گوشۂ گمنامی میں پڑا رہا لیکن اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنا وہ آخری نبی بھیج کر اسے عزت و شرف سے نوازا جس نے تمام عالم کو نورِ ہدایت سے منور کر دیا اور اس کے ذریعہ وہ تمام مقاصد اور اغراض پورے ہوئے جو اس گھر کی تعمیر کے وقت

پیش نظر تھے۔ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اس کے سوا اور کوئی مقصود نہ تھا کہ آپ دینِ ابراہیمی کا اتباع و تکمیل، اسلام کی دعوت و تبلیغ اور دینِ حنیفی کو قائم کر کے خانۂ کعبہ کو جو مرکزِ توحید و اسلام اور ملتِ ابراہیمی کے پیروؤں کا قبلہ ہے مشرکین اور کفار کے قبضہ و اقتدار سے نکال کر خدا کے صالح بندوں کے انصرام و اختیار میں لائیں اور اس گھر کے حج و زیارت کی پوری امت کو تلقین کریں تاکہ وہ یہاں سے عشق و محبتِ الٰہی کا سبق لے۔ قرآن مجید نے بھی اس گھر کی تعمیر کا مقصد شرک و بت پرستی کا استیصال بتایا ہے اور اسی لیے حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو یہاں آباد کیا گیا تھا تاکہ ان کی نسل بت پرستوں سے گزندہ نہ ہونے پائے اور اسی لیے دونوں باپ بیٹے اس گھر کو بناتے وقت خدا سے اس نبی کی بعثت اور ایک امتِ مسلمہ کے قیام و ظہور کی دعائیں کرتے جا رہے تھے:۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (بقرہ ۱۲۷ تا ۱۲۹)

اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل خانۂ خدا کی بنیادیں رکھ رہے تھے اور ان کی زبانوں پر یہ دعا جاری تھی کہ اے ہمارے پروردگار ہماری یہ خدمت قبول کر، بیشک تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں اپنا فرمانبردار بندہ بنا اور ہماری نسل میں سے ایک فرمانبردار امت بنا اور ہم کو ہماری عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول کر، بیشک تو توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے اور اے پروردگار ان میں ان ہی کے اندر سے ایک رسول بھیج کہ وہ ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

ہم خانۂ کعبہ کی مرکزیت اور اس کے دینِ الٰہی کی اصل و اساس ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھ چکے ہیں کہ آنحضرت صلعم کی بعثت کا مقصد دینِ حنیفی کا قیام و تکمیل اور اسلام کی دعوت و تبلیغ ہے اس لیے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں البتہ اس آیت میں اس مقصد کی تکمیل کے چند طریقے بیان کیے گئے ہیں یعنی تلاوتِ آیات، تعلیم شریعت، تعلیم حکمت اور تزکیہ وغیرہ۔ (باقی)

بقیہ سفرِ حج

کے لیے یہ مشقت میری طبیعت پر نہایت شاق گزری، لیکن خاموشی کے ساتھ برداشت کر لینے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ہم اس دار الابتلاء سے چھوٹ کر گھر واپس لوٹنے کے لیے جب موٹر رکشا میں بیٹھے تو میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہو کیسی گزری؟ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ غصہ سے بھری ہوئی ہوں گی اور سارا غصہ میرے اوپر نکالیں گی، لیکن میرے اندیشہ کے بالکل خلاف وہ نہایت ٹھنڈے لب و لہجہ میں بولیں کہ اس راہ میں سب کچھ جھیلنا عبادت ہے، تکلیف تو ہوگی مگر اللہ کا شکر ہے کہ کام ہو گیا۔ میں نے کہا تمہارا خیال صحیح ہے ہمارے لیے تو یہ عبادت ہے ہی۔ یہ ہمارے ارباب کار بھی ہمارے ستانے کے لیے یہ طریقے عبادت سمجھ کر ہی اختیار کرتے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ ان تکلیفوں اور ذلتوں سے حاجیوں کے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

حاجی کیمپ اس سلسلہ میں بالکل پہلی مرتبہ کراچی کا مشہور حاجی کیمپ دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کی شکایتیں مختلف دوستوں کی زبانی سنی تو بار بار تھیں، لیکن صحیح صورتِ حال کا جائزہ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ہوا۔ یہ حاجی کیمپ اس نظریے پر تعمیر ہوا ہے کہ عازمین حج دھوپ اور سردی گرمی کے احساس سے عاری ہوتے ہیں۔ اس میں عورتوں کے لیے پردے کی ضرورت کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ جن کو پردہ کا احترام ملحوظ تھا انھوں نے رسیاں تان تان کر ان پر کھیس اور چادریں ڈال رکھی تھیں۔ عورتوں کے غسل کرنے کے لیے بھی کسی باپردہ جگہ کا کوئی انتظام نہیں تھا جو بیچاریاں نہانا چاہتی تھیں ان کی پردہ پوشی کے لیے صرف اڑھائی تین فٹ اونچی ایک دیوار کافی سمجھی گئی تھی۔

ہمارے دوست حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انھوں نے منتظمین کو توجہ دلائی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم عورتوں کے نہانے کے لیے کسی باپردہ جگہ ہی کا وہ انتظام کر دیں۔

منتظمین نے پہلے تو یہ عذر کیا کہ گزشتہ گیارہ بارہ سالوں میں ان سے اس طرح کا مطالبہ کسی نے نہیں کیا لیکن جب کچھ ردّ و قدح کے بعد ان پر یہ حقیقت واضح کی گئی کہ کسی بات کے معقول ہونے کے لیے تنہا یہی دلیل نہیں ہوتی کہ مطالبہ کیا جائے تو انھوں نے ایک قنات کا انتظام کر دیا۔

ایک اسلامی حکومت میں حجاج کے ساتھ یہ سنگدلانہ سلوک اور وہ بھی عین مرکزِ حکومت میں نہایت افسوسناک بھی ہے اور نہایت شرمناک بھی۔[1]

[1] اب ہماری حکومت سنا ہے نیا حاجی کیمپ بنوا رہی ہے جس سے یہ تکلیفیں امید ہے دور ہو جائیں گی۔

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

سفر کی پہلی منزل

اس سفرنامہ کی چند قسطیں ہفتہ وار "المنبر" لائل پور میں شائع ہونے کے سبب سے "میثاق" میں نہیں شائع کی گئی تھیں۔ ان کے لیے رسالہ کے قارئین کا اصرار برابر جاری ہے۔ اس وجہ سے صفحات کی کمی کے باوجود یہ قسط ہم دی جا رہی ہے اور اب یہ سلسلہ ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ (اڈیٹر)

سفر کا ارادہ کر لینے کے بعد سب سے پہلا سوال رفقائے سفر سے متعلق دل میں پیدا ہوا۔ یوں تو رفقائے سفر کی اہمیت ہر سفر میں ہے لیکن سفر حج میں اس کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ سفر ایک بڑی سخت کسوٹی ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے رفقاء کا انتخاب کچھ آسان نہیں تھا۔ میری خواہش یہ تھی کہ اس سفر میں اخوئم شیخ سلطان احمد صاحب (کراچی) ڈاکٹر عثمانی صاحب (کراچی) حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب (لائل پور) اور میری اہلیہ کی رفاقت مجھے حاصل ہو سکے۔ اس انتخاب میں محبت اور اعتماد کے علاوہ اس بات کو بھی دخل تھا کہ مقدم الذکر دو رفیق اس منزل کے راہ و رسم سے پہلے سے واقف تھے، لیکن یہ میری اپنی خواہش تھی، اس کے پورے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی لکھی ہوئی تقدیر پر تھا۔ میں نے سلطان احمد صاحب اور حکیم عبد الرحیم اشرف صاحب کو اپنے ارادۂ سفر کی اطلاع دی اور ان کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ عبد الرحیم اشرف صاحب کے حالات اگرچہ سازگار نہ تھے لیکن وہ اللہ کا نام لے کر آمادہ ہو گئے۔ سلطان احمد صاحب نے بعض مجبوریوں کی بنا پر عذر کیا۔ ان کے عذر کر دینے کے بعد میں نے ڈاکٹر عثمانی صاحب کو لکھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ یہ حضرات جب بھی جائیں، ایک ساتھ جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ البتہ ان دونوں صاحبوں کی بجائے

لاہور کے دو نوجوان رفیق — مولوی برکت علی صاحب اور اسلم صاحب آمادۂ رفاقت ہوگئے۔ ان دونوں دوستوں کے آمادہ ہوجانے سے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اس خوشی میں کچھ دخل میری خود غرضی کو بھی تھا۔ سفر تو مجھے زندگی میں بہت کرنے پڑے ہیں، چھوٹے بھی اور بڑے بھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں سفر کے معاملہ میں بڑا کچا واقع ہوا ہوں، اس وجہ سے میری دلی خواہش تھی کہ ایک دو رفیق ایسے مل جائیں جو ضرورت کے وقت میری مدد کرسکیں اور ان کی امداد نہ ان کے لیے موجبِ تکلیف ہو نہ میرے لیے موجبِ تکلف۔ اس سفر میں میری خاص مشکل یہ تھی کہ میں زنانہ کے ساتھ سفر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ زنانہ ساتھ ہو تو چاہے مشکلاتِ سفر میں کوئی خاص اضافہ نہ ہو، لیکن فکرِ سفر دو چند ضرور ہوجاتی ہے۔

ایک مختصر سے قافلہ کی شکل بن جانے کے بعد درخواستیں بھیج دی گئیں۔ ہمارے پاکستان میں جہازوں کی کمی اور زرِ مبادلہ میں کفایت کے سبب سے عازمینِ حج کی درخواستوں کا فیصلہ قرعہ کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ درخواستیں بھیج دینے کے بعد ایک خاموش تشویش کے ساتھ انتظار ہونے لگا کہ دیکھیے قرعہ کی زبان کیا فیصلہ صادر کرتی ہے؟ بڑی انتظار کے بعد معلوم ہوا کہ قرعہ میں میرا، میری اہلیہ کا اور حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کا نام آگیا ہے لیکن ہمارے دو رفیقوں کے نام نہیں آئے۔ قرعہ کے عام قاعدہ کی رُو سے ایک پارٹی کے سارے درخواست دہندوں کا ایک ہی حشر ہوتا تھا، یا تو سب فائز المرام یا سب نامراد، اس وجہ سے تعجب ہوا کہ قرعہ نے یہ امتیاز کیوں برتا؟ اس معمہ کو حل کرنے کے لیے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے کراچی کا سفر کیا۔ معلوم ہوا کہ بعض ٹیکنیکل غلطیوں کے سبب سے ہمارے دو رفیقوں کی درخواستیں شاملِ قرعہ نہ ہوسکیں اگرچہ اس بات سے صدمہ تو بہت ہوا، لیکن فیصلۂ تقدیر کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا اور کیا چارہ کار تھا۔

درخواستیں منظور ہوجانے کے بعد پاسپورٹ اور ہیضہ اور چیچک کے ٹیکوں کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ ہیضہ کے ٹیکوں کے لیے شرط تھی کہ دو ہوں اور ان دونوں کے درمیان شاید آٹھ دنوں کا وقفہ ہو، اور اگر اس میں بدقسمتی سے ایک دن کی بھی تقدیم و تاخیر واقع ہوجائے تو پچھلا کورس منسوخ۔ پھر سے اسی ترتیب اور انہی آداب و شرائط کے ساتھ دوسرا کورس شروع کرائیے۔ پھر بین الاقوامی فارم پر سرٹیفکیٹ حاصل کیجیے، اور چونکہ یہ سرٹیفکیٹ عام ڈاکٹروں سے حاصل نہیں کیے جاسکتے تھے بلکہ محکمۂ صحت کے ڈاکٹروں ہی سے حاصل کیے جاسکتے تھے، اس وجہ سے ان کے حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو کافی دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی تھی، اور اکثر حالات میں رشوتیں بھی دینی پڑتی تھیں۔ یہ مرحلہ طے کرچکنے کے بعد پاسپورٹ کی فکر ہوئی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا

شکر ہے کہ پاسپورٹ کا معاملہ نسبتاً آسانی سے طے ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دفتر میں ایک دیندار مسلمان تھے جنھوں نے یہ کام نہایت مستعدی اور ہمدردی کے ساتھ انجام دے دیا۔

معلّم کا انتخاب

اسی مرحلہ میں معلّم کا انتخاب کرلینا بھی ضروری تھا۔ معلّم کے بغیر حج اور سفرِ حج کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ضروری تھا کہ معلّم کا تعین کرلینے کے بعد اس کا نام نامی اپنے تمام چھوٹے بڑے سامان پر بخطِ جلی لکھوا دیا جائے کیونکہ جدہ کے ساحل پر قدم رکھتے ہی آدمی کی اپنی ہستی بالکل فنا ہوکر معلّم کی ہستی میں گم ہوجاتی ہے۔ مجھے بدقسمتی سے معلّم کے نام سے وحشت تھی۔ میں نے شروع ہی سے حج کا تجربہ رکھنے والوں کو معلموں کے بُرے ہونے پر پوری طرح متفق، متفق اللفظ پایا تھا کہ شاید ہی اس بارہ میں کسی کا اختلافِ رائے منقول ہو، حتیٰ کہ جو لوگ سرزمینِ حجاز کی کسی خراب سے خراب چیز کو بھی خراب کہنا خلافِ دینداری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے بھی کم از کم معلّم کا گلہ تو ضرور کیا ہے۔ اس وجہ سے میں سخت پریشان تھا کہ دیکھیے تقدیر ہماری باگ کس کے ہاتھ میں پکڑاتی ہے۔ کبھی کبھی خیال آتا کہ معلّم کی پابندی کیا ضروری ہے؟ کیوں نہ ہم معلّم کے بغیر ہی حج کرڈالیں۔ میں نے دبی زبان سے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو وہ بولے کہ اس کا تو تصور بھی نہ کرو۔ معلّم حج کے سلسلہ کی ایک ناگزیر برائی ہے جس سے تم کسی صورت میں نہیں بچ سکتے۔ تمہاری تو کیا ہستی ہے، اس زمانہ میں اگر ...... بھی حج کے لیے آجائیں تو انھیں بھی کسی نہ کسی معلّم ہی کی رہنمائی میں حج کرنا پڑے گا۔

اس بات کے بعد کہاں گنجائش باقی رہ گئی تھی کہ ایک عازمِ حج معلّم سے گریز کی کوئی راہ سوچ سکے۔ میں اسی حیص بیص میں تھا کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے لکھا کہ معلّم کی حیثیت سے سید عقیل عطاس اچھے رہیں گے۔ میں ان کے بارہ میں پہلے سے کوئی معلومات نہیں رکھتا تھا۔ حکیم صاحب نے میری طبیعت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان کی سفارش میں صرف یہ بات لکھی کہ ان کے پاس حاجی کم آتے ہیں اس لیے کہ یہ دلالوں اور ایجنٹوں کو حاجیوں کے پھانسنے کا ذریعہ نہیں بناتے۔ مجھے یہ بات پسند آئی اور میں نے اللہ کا نام لے کر اپنے تمام سامان پر ان کا نام لکھوا دیا۔ بعد میں برادرم باقر خاں صاحب (ملتان) اور سید عبدالعزیز شرقی صاحب سے ملاقات ہوئی تو ان دونوں دوستوں نے بھی اپنے اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر اس انتخاب کی تائید کی۔ باقر خاں صاحب نے عقیل صاحب کی کم آمیزی اور خشکی کی تھوڑی سی شکایت بھی کی لیکن مجھے اس سے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ میں نے خیال کیا کہ جو آدمی کم آمیز اور کم سخن ہوگا وہ چرب زبانی، اور سخن سازی کے بجائے اپنے حسنِ خدمت پر اعتماد کرتا ہوگا۔ الحمدللہ بعد کے تجربات نے ثابت کیا کہ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔

ضروریاتِ سفر اور ذہن کی تیاری

ضروریاتِ سفر کے متعلق میں نے برادرم سلطان احمد صاحب کو لکھا کہ اس سفر کے لیے جو چیزیں ضروری ہوں اُن کی تفصیلی فہرست بنا کر بھیج دیں، انھوں نے دو فہرستیں بنا کر بھیج دیں، ایک میں وہ چیزیں درج تھیں جو ہمیں لاہور سے ساتھ لینی تھیں اور دوسری میں وہ چیزیں تھیں جو کراچی سے لینی تھیں۔ ہم نے اسی فہرست کے مطابق سامان تیار کرایا لیکن ہم سلطان صاحب کے مشوروں کے ساتھ حج کا تجربہ رکھنے والے دوسرے مشیروں کے مشوروں سے بھی مستفید ہوتے رہے، جو مخلصین ملنے آتے، وہ اپنے اپنے تجربات کے لحاظ سے کچھ نہ کچھ مشورے ضرور دے جاتے اور ہم چونکہ اس کوچہ سے بالکل ہی نابلد تھے، اس وجہ سے قدرتی طور پر ہر ایک کے مشوروں سے کچھ نہ کچھ متاثر بھی ہو جاتے۔ اس طرح ہمارا سامان چلتے وقت تک بار بار بڑھتا اور گھٹتا رہا۔ میں سفر میں سامان سے چونکہ سخت گھبراتا ہوں، اس وجہ سے ہر وہ مشورہ جو سامان کم کرنے کے بارہ میں ہو، مجھے پسند آجاتا، لیکن تجربہ نے ثابت کیا کہ اس سفر میں سامان کے کم لینے کا وہ رجحان جو میرے اندر پایا جاتا ہے صحیح نہیں ہے۔ ضرورت کی چیزیں ضرور ساتھ ہونی چاہئیں اگرچہ ان کے سبب سے راستہ میں کچھ زحمت بھی ہو۔

مادی تیاری کے ساتھ ساتھ ذہنی تیاری کی بھی ضرورت تھی۔ حج کے احکام و مناسک پر جو کچھ پڑھا تھا اب تک اس کی کبھی ضرورت نہیں پیش آئی تھی اس لیے کچھ نہیں معلوم تھا کہ کتنا حصہ ذہن میں محفوظ ہے اور کتنا ضائع ہو چکا ہے۔ اب ضرورت پیش آئی تو خیال ہوا کہ پچھلی معلومات کا جائزہ لیا جائے۔ مفصل و مطول کتابیں پڑھنا تو سفر کی اس تیاری میں مشکل تھا۔ اس وجہ سے خیال ہوا کہ حج کے احکام و مناسک پر لوگوں کے لکھے ہوئے عام رسائل جو ملتے ہیں، ان میں سے کوئی قابلِ اعتماد رسالہ پڑھ لیا جائے۔ مخدوم مکرم مولانا محمد منظور نعمانی مدیر الفرقان (لکھنؤ) کا ایک رسالہ عرصہ ہوا میں نے پڑھا تھا اور وہ مجھے پسند آیا تھا۔ میں نے اس کے لیے ان کو لکھا۔ انھوں نے ازراہِ نوازش اپنا رسالہ بھی بھیج دیا اور ساتھ ہی بعض دوسرے رسالے بھی بھیج دیے۔ نیز میرے رجحانِ طبع کا لحاظ رکھتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ کے رسالہ مناسکِ حج کے لیے یاددہانی کی کہ تم اس کو پڑھو، یہ تمھیں پسند آئے گا۔ بعض رسالے محمد عاصم حداد صاحب نے بھی فراہم کر دیے۔ اگرچہ سفر کی تیاریوں اور ملاقاتوں کی آمد و شد کے سبب سے ان کتابوں کے پڑھنے کا موقع بہت کم مل سکا، تاہم میں نے اکثر رسالے پڑھ ڈالے اور ان کی ضروری باتیں محفوظ کر لیں جو نہ پڑھ سکا ان کو اطمینان کے ساتھ جہاز میں پڑھنے کے لیے ساتھ رکھ لیا۔ ان میں سے مولانا محمد منظور نعمانی کا رسالہ میری اہلیہ کو بہت

پسند آیا اور امام ابن تیمیہؒ کے رسالہ سے میری بہت سی اُلجھنیں دور ہوئیں۔

گھر کا انتظام

ہم میاں بیوی دونوں کے سفر پر روانہ ہو جانے کے بعد ہمارے گھر کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی ایک ٹیڑھا مسئلہ تھا اور اس سے زیادہ ٹیڑھا مسئلہ مدرسہ اصلاح البنات کی نگرانی کا تھا جو میری اہلیہ نے بچیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے قائم کیا ہے اور جو اب خدا کے فضل سے کافی ترقی کر چکا ہے۔ ہمارے بعد گھر پر صرف میری ساس اور میری چھوٹی بچی مریم صدیقہ سلمہا باقی رہ جاتی تھیں۔ میری ساس برسوں سے صاحبِ فراش ہیں۔ اس وجہ سے جتنا اہم مسئلہ بچی کی نگرانی کا تھا، اس سے زیادہ اہم سوال والدہ صاحبہ کی تیمارداری کا تھا۔ میرے دونوں لڑکے جو پاکستان میں ہیں، راولپنڈی میں رہتے ہیں جن میں سے ایک زیرِ تعلیم ہے اور دوسرے کو اپنے اخبار سے فرصت نہیں۔ خیال ہوا کہ مریم کو ساتھ لیتے چلیں، لیکن اس میں دوسری بہت سی مشکلات کے علاوہ ایک بہت بڑی مشکل یہ تھی کہ میری ساس، میری اہلیہ کو حج کی اجازت دینے پر راضی ہی اس شرط پر ہوئی تھیں کہ میری دونوں لڑکیاں ان کے ساتھ رہیں۔ اس وجہ سے اس کے سوا کوئی اور شکل نظر نہیں آئی کہ بڑی لڑکی کو اس کے گھر سے بلایا جائے اور اماں کو، اور مریم کو اس کے حوالے کیا جائے۔ اس کے متعلق جب میں نے اپنے داماد نعمان شبلی سلمہ کو خط لکھا تو انھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کو خوشی سے اجازت دے دی بلکہ اپنی شدید معذوریات کے باوجود یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہفتہ میں ایک بار بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملتان سے لاہور آتے رہیں گے۔ میرے لاہور کے دوستوں میں سے مولوی محی الدین سلمہ اور مولوی برکت علی صاحب نے بھی وقتاً فوقتاً دیکھ بھال کرتے رہنے کا وعدہ کیا۔ مدرسہ کا داخلی انتظام مدرسہ کی استانیوں اور خارجی نظم و نسق برادرم رانا اللہ داد خاں صاحب کے سپرد کیا گیا۔

کراچی کے لیے روانگی

ہمیں سردھنا جہاز سے سفر کرنا تھا جو کراچی سے جدہ کے لیے ۱۶ مئی سنہ ۶۰ء کو روانہ ہونے والا تھا۔ ہم نے خیال کیا کہ جہاز کی روانگی سے زیادہ سے زیادہ دو تین دن پہلے کراچی پہنچ جانا کافی ہو گا۔ چنانچہ اسی لحاظ سے ہم نے پروگرام بنایا اور سلطان احمد صاحب کو کراچی اس کی اطلاع دے دی۔ سفر کی تیاریاں اسی لحاظ سے جاری تھیں کہ حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب نے احتیاطاً حج آفیسر کو ٹرنک کال کیا۔ ان سے معلوم ہوا کہ ہمیں جہاز کی روانگی کی تاریخ سے ایک ہفتہ پیشتر کراچی پہنچ جانا چاہیے۔ تاریخِ سفر کی اس فوری تبدیلی سے سخت پریشانی ہوئی، کپڑے دھوبی یا درزی کے پاس ہیں، روپے کسی کے پاس ہیں اور وہ کسی ضرورت سے باہر گیا ہوا ہے، عزیزوں اور دوستوں کو ایک خاص تاریخ کی اطلاع ہو چکی ہے اور اب دوسری اطلاع کے

لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے ، اس طرح کے متعدد مسائل سامنے آن کھڑے ہوئے ، لیکن حکیم حاکم رگ مفاجات اس کے سوا چارہ ہی نہیں تھا کہ اپنے سارے پروگرام کو درہم برہم کر کے حج آفیسر کے حکم کی تعمیل کی جائے چنانچہ ہم اسی افراتفری کے عالم میں اپنے اپنے گھروں سے کراچی کے لیے روانہ ہو گئے ۔

گھر سے روانگی کے وقت ہم نے دو دو رکعت نفل پڑھ کے سفر کی مسنون دعائیں کیں ۔ میری اہلیہ نے اپنی والدہ سے رو رو کر اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگی اور سفر کی اجازت چاہی ۔ میں نے بھی ان سے معافی اور دعا کی درخواست کی ۔ جواب میں ان کی طرف سے دعائیں ہی دعائیں تھیں ۔ یہ بیچاری ہمارے لیے ہمیشہ سراپا دعا رہی ہیں ۔ اس کے بعد میں نے گھر بار کو خدا کے حوالے کیا ۔ میری خواہش تھی کہ بچے اسٹیشن جانے کے لیے ضد نہ کریں لیکن میں نے دیکھا تو سب تیار کھڑے ہیں ، یہاں تک کہ ہمارے تختے سے سلمان سلمہ بھی تیار ہیں ، ان کے شوق کو دیکھ کر میں نے ان کو روکنے کی کوشش مناسب نہیں سمجھی ۔

گاڑی آئی جو احباب و مخلصین اسٹیشن پر آ گئے تھے ، ان سے رخصت ہوا ۔ بچوں کو پیار دیا اور مسنون دعا کے ساتھ ان کو خدا کے حوالے کیا ۔

اس موقع پر مجھے ایک اندیشہ تھا ، وہ یہ کہ مریم سلمہا اپنی ماں سے کبھی جدا نہیں ہوئی تھی ۔ یہ پہلا موقع تھا جب ماں اور بیٹی دونوں کو جدائی کا تجربہ کرنا تھا ، مجھے بڑا خطرہ تھا کہ یہ منظر رقت انگیز بن جائے گا ، اور بہت ممکن ہے کہ یہ میرے دل پر کوئی ایسا نقش چھوڑ جائے جو پورے سفر میں قائم رہے ، لیکن الحمد للہ کہ اس طرح کی کوئی بات پیش نہیں آئی ۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ بچی نے اپنی ماں کی تربیت کا نہایت گہرا اثر قبول کیا ہے اور اب وہ ماشاء اللہ سمجھ دار ہو گئی ہے ۔

راستہ کے احباب میں سے میں نے کسی کو اپنے سفر کی اطلاع نہیں دی تھی ، صرف نعمان میاں کو ملتان اور سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری کو رحیم یار خاں اطلاع بھجوانے کی کوشش کی ۔ لیکن پروگرام کی فوری تبدیلی کے بعد مجھے توقع نہیں رہی تھی کہ ان کو اطلاع پہنچ سکی ہو گی مگر میری توقع کے خلاف ملتان اسٹیشن پر نعمان سلمہ اپنی ہمشیرہ ، ان کے بچوں اور ہمارے لیے زاد راہ کے ساتھ موجود تھے اور رحیم یار خاں کے اسٹیشن پر سردار محمد اجمل خاں صاحب ، امین لغاری صاحب اور متعدد احباب و مخلصین موجود تھے ۔

کراچی کے متعلق بھی مجھے اندیشہ تھا کہ شاید پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع صحیح وقت پر سلطان احمد صاحب کو نہ

سلہ بعد میں مولانا سلمہ اللہ کی والدہ صاحبہ نے انتقال فرمایا ۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے ۔

پہنچ سکی ہو ۔ لیکن اسٹیشن پر یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ نہ صرف وہ خود موجود ہیں بلکہ دوسرے تمام احباب بھی موجود ہیں یہاں تک کہ میری اہلیہ کو لینے کے لیے شاہدہ سلمہا بھی آئی ہوئی ہیں ۔ ہم مسنون دعائیں پڑھتے ہوئے کراچی اسٹیشن پر اترے اور سلطان صاحب کے مکان واقع پیر الٰہی کالونی کے لیے روانہ ہو گئے ۔

کراچی میں ایک ہفتہ جہاز کی تاریخ روانگی کے لحاظ سے ہمیں پورا ہفتہ کراچی میں گزارنا تھا جبکہ سفر کی ساری تیاریاں مکمل ہو چکی ہوں ، صرف زر مبادلہ اور ٹکٹ کا مرحلہ باقی ہو ، اس کے لیے پورا ہفتہ کراچی میں ضائع کرنا طبیعت پر بڑا شاق گزرا ۔ افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں نے ابھی وقت کی قدر و قیمت نہیں پہچانی ہے ، حالانکہ ریلوں ، دخانی جہازوں اور ہوائی جہازوں کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ ان سے وقت کی بچت ہوتی ہے ۔ اب یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ جو جہاز ۶ دنوں میں کراچی سے جدہ پہنچا رہا ہو محض اس پر مسافروں کو لادنے میں ہم پورے سات دن کھپا دیں ۔ پھر سائنس کی ان ترقیوں کا ہمیں فائدہ کیا ہوا ؟ مالی اعتبار سے بھی اس صورت حال کی تحسین نہیں کی جا سکتی ۔ میں تو خیر اپنے ایک دوست کا مہمان تھا لیکن میرے جن ساتھیوں کو کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا ، وہ کافی زیر بار ہوئے اور جو بے چارے اس جہاز کے لیے کراچی کے حاجی کیمپ میں ٹھہرے ہوں گے ، ان کی تکلیفوں کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا ۔

بعض دوستوں کی طرف سے خواہش کی گئی کہ ان فارغ دنوں میں ایک تربیتی پروگرام جاری کر دیا جائے ۔ لیکن میں اس کے لیے تیار نہ ہوا کیونکہ وقت اگرچہ فارغ تھا صرف ملنے جلنے والوں کی نذر ہو رہا تھا ، لیکن ایک اہم سفر درپیش ہونے کے سبب سے میرا ذہن فارغ نہ تھا ۔

کراچی میں اترتے ہی حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب وغیرہ نے زر مبادلہ اور ٹکٹ کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی ، مجھے اس سلسلہ میں بعض کاغذات پر دستخط کے سوا اور کچھ کرنا نہیں پڑا ۔ لاہور کے پاسپورٹ آفس کی طرح یہاں بنک میں بھی تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک دین دار مسلمان مل گئے اور انھوں نے سارا کام نہایت عجلت کے ساتھ کر دیا ۔

البتہ ایک کام مجھے بھی کرنا پڑا اور وہ خاصہ تکلیف دہ رہا ۔ لاہور میں ہم نے چیچک اور ہیضے کے جو ٹیکے لگوائے تھے ۔ معلوم ہوا کہ ان کا یہاں بھی معائنہ ہو گا اور اس کے لیے مجھے بھی اور میری اہلیہ کو بھی حاجی کیمپ جانا پڑے گا ۔ جن چیزوں کے سرٹیفکیٹ اتنے اہتمام کے ساتھ اپنے اپنے ضلعوں میں حاصل کیے جا چکے

حرف، اُس چیز کے لیے یہ مزید تکلف اور اہتمام کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ لیکن چونکہ ہم حج کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے۔ اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس راہ میں جو صعوبتیں اور جو دقتیں پیش آئیں، ان کو چُپ چاپ برداشت کریں۔ چنانچہ ہم اس کام کے لیے مقررہ وقت پر حاجی کیمپ پہنچے۔ جس کمرے میں معائنہ ہونے والا تھا وہ نیچی چھت کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ اگرچہ ان دنوں کراچی میں گرمی کا بڑا زور تھا، لیکن بجلی کی فراوانی کے باوجود اس کمرے میں کوئی پنکھا نہیں تھا۔ چھوٹے سے کمرے میں سینکڑوں مرد اور عورتیں، بچوں کے ساتھ بھرے ہوئے تھے۔ لوگوں کے شور و ہنگامہ اور بچوں کی چیخم دھاڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ گرمی کی وہ شدت کہ الامان! — بیٹھنے کے لیے صرف اسٹول طرز کی چند بنچیں تھیں، جن پر "سابقون الاوّلون" بیٹھے ہوئے تھے، باقی سارے لوگ خواہ وہ بوڑھے ہوں یا بچے یا عورتیں، ڈاکٹر صاحب کی میز کے یمین و یسار کھڑے تھے۔ لطف یہ کہ خود ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔ صرف ان کے کمپونڈر صاحب موجود تھے جو لوگوں کے سرٹیفکیٹ لے کر جمع کرتے جاتے تھے۔ بعض نیک دل حاجی خود تو پسینہ میں شرابور تھے لیکن ان کمپونڈر صاحب کو پنکھا جھل رہے تھے۔ یا تو ان کو یہ غلط فہمی تھی کہ یہی ڈاکٹر صاحب ہیں۔ یا یہ خیال کرتے ہوں گے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے مقرب ہیں، ان کا کام جلدی کرا دیں گے۔

میں نے اپنی اہلیہ کو بڑی مشکل سے ایک کونے میں بٹھایا اور خود ایک دوسرے کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ جب کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہو گئیں، تو مجھے خیال ہوا کہ اب آن پر زیادہ مرنا اچھا نہیں ہے کہیں بیٹھ جانا چاہیے۔ زمین پر ہی سہی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ لوگ کمرے میں داخل ہونے والے کمپونڈر کو ڈاکٹر سمجھ کر پاس کی بنچ سے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور بنچ پر بیٹھ گیا اور یہ فیصلہ کر کے بیٹھا کہ میں آخری شخص ہوں گا جو اس بنچ پر سے اُٹھے گا۔ اگرچہ میں بے شمار کھڑے ہوئے آدمیوں کے اندر اس طرح بیٹھا ہوا کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے ایک آدمی سرکنڈوں کے کسی گھنے جنگل کے اندر چھپا ہوا بیٹھا ہو۔ تاہم میں نے اسی کو اپنی ایک بڑی کامیابی سمجھا۔

ڈھائی تین گھنٹے کے بعد جب مطلع ذرا صاف ہوا، تو میں نے اپنی بیوی کو آواز دی۔ ان کو دیکھا تو وہ ہوا کی تلاش میں اپنی جگہ چھوڑ کر ایک اور جگہ دیوار کا سہارا لیے بیٹھی ہیں۔ وہ اٹھیں تو میں نے اپنے آپ کو ڈاکٹر صاحب کے سامنے معائنہ کے لیے پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارے ٹیکوں کے نشان دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائے بغیر ہمارے فارموں پر ٹک مارک لگا دیئے — ایک بالکل غیر ضروری اور بوگس کارروائی

(باقی صفحہ [illegible] پر)

تقریظ و تنقید

● اِسلام کا نظامِ عدل

مصنف :- استاذ سید قطب

مترجم :- محمد نجات اللہ صدیقی

شائع کردہ :- مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند محلہ کشن گنج دہلی ۶

اس کتاب کے مصنف سید قطب اخوان المسلمون کے لیڈر ہونے کی وجہ سے دین پسند مسلمانوں میں خاص شہرت کے مالک ہیں۔ اس کتاب کے ذریعہ سے انھوں نے جو پیغام پہنچانے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر جن مصیبتوں میں گھر گئی ہے ان سے نجات اگر اسے حاصل ہو سکتی ہے تو صرف اسلام کے عادلانہ نظام کو اختیار کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے اور صحیح اسلامی روح ہی بہترین سماج کی پرورش کی ضامن ہے۔ فاضل مصنف کے نزدیک اسلام کا یہ عادلانہ نظام زندگی کے سیاسی یا اقتصادی ہی پہلو پر حاوی نہیں ہے بلکہ زندگی کے تمام مظاہر اور اس کی سرگرمیاں اس سے متاثر ہوتی ہیں اور اس نظام کی اصل افراد اور جماعتوں کے درمیان تعاون و دستگیری کی اسپرٹ ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ نظام تین بنیادوں پر قائم ہے — مطلق اور مکمل آزادئ ضمیر — کامل انسانی مساوات۔ کفالت باہمی۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لیے، مصنف کی رائے میں، اسلام ایک طرف انسان کے قلب و ضمیر کی اصلاح و تربیت کرتا ہے اور دوسری طرف قانون سازی کرتا ہے، اور یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر اسلامی قانون انسانی قوانین کے بالمقابل ہر زمانہ میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف نے اپنے ان نتائج فکر کو قرآن و سنت سے خوب مدلل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں وہ بہت بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ اپنے اس فکر کو مزید مدلل کرنے کے لیے انھوں نے اسلام کے سیاسی و اقتصادی نظام کو تفصیل سے پیش کیا ہے اور خاصے جامع مقالات تحریر کیے ہیں۔ ان کی یہ رائے پڑھ کر بہت خوشی حاصل ہوئی کہ وہ آج کل کے عام مصنفین کی طرح اسلام کا رشتہ دوسرے نظاموں سے جوڑنے کی کوششوں کو مہمل سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ تحریر

فرماتے ہیں :

اسلام انسانیت کے مختلف مسائل کے ایسے حل پیش کرتا ہے جو اپنی جگہ مستقل اور اپنی شان میں منفرد ہیں۔ ان حلوں کو وہ اپنے بنیادی فکر، اپنی اصولی بنیادوں اور اپنے منفرد طریق کار سے اخذ کرتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہوتا ہے کہ جب ہم ان حلوں کی تحقیق کریں تو ان کا رشتہ خواہ مخواہ دوسرے نظریات اور بنیادوں سے نہ جوڑیں .... بہت سے لوگ جن کا طرز فکر اور طرز عمل اجنبی طور طریقوں سے بری طرح متاثر ہو چکا ہے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام میں ان نظاموں کا جوڑ پیوند لگا کر اسلام کے لیے کچھ تازہ طاقت فراہم کر رہے ہیں۔ یہ خیال سراسر باطل اور اسلام کے حق میں انتہائی مفسدانہ خیال ہے۔ یہ اس کی روح کو ناکارہ بنا کر چھوڑے گا۔ ساتھ ہی یہ ایک طرح کے احساسِ ہزیمت کے ہم معنی بھی ہے، چاہے صراحت کے ساتھ اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔ (ص ۱۴)

کتاب میں عام طور پر فاضل مؤلف نے اپنی اس رائے کا احترام ملحوظ رکھا ہے لیکن جہاں تک اسلام کے اقتصادی نظام پر بحث کا تعلق ہے، ہمیں یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ مصنف اشتراکیت کے بعض غلط اصولوں کو پسند کرتے ہیں اور اسلام کے منہ سے بھی ان اصولوں کی تائید کروانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حقِ ملکیت کے بارے میں اسلام کا پہلا اصول وہ یہ بتاتے ہیں کہ مال و دولت عمومی حیثیت میں جماعت کا حق ہے اور فرد کو یہ حق جماعت کے نمائندہ کی حیثیت سے ملا ہے اس لیے یہ حق فرد کو اسی وقت تک حاصل رہ سکتا ہے جب تک فرد اپنی نالائقی اور نادانی کا مظاہرہ نہ کرے اور یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ اس کا انتظام بخوبی سنبھال سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ بات اس اجمال کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ بلاشبہ نالائقی اور بدانتظامی کی بعض صورتوں میں اسلام نے حکومت کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ کسی ملکیت کے مالک کے تصرفات پر بعض پابندیاں عائد کر دے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اگر کوئی مالک نادانی کا مظاہرہ کرے تو اس کی ملکیت ہی ضبط کر لی جائے۔ اس اصول کی تائید میں مصنف نے چار آیات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے، جو ہمارے نزدیک محض تکلف ہے۔ سورہ حدید کی آیت ۷ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ اور سورہ نور کی آیت ۳۳ واٰتوھم من مال اللہ الذی اٰتاکم سے تو صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو جو ملکیت حاصل ہے وہ خدا کی بخشی ہوئی ہے، اس لیے انسان اس کے بارے میں خدا ہی کے سامنے جواب دہ ہے۔ فی الحقیقت

بات یہی صحیح ہے اور اس کی تائید قرآن مجید کے دوسرے مقامات سے ہوتی ہے۔ سورہ نحل کی آیت ۷۱ واللہ فضل بعضکم علیٰ بعض فی الرزق ... الخ، جیسا کہ فاضل مترجم نے حاشیے میں لکھا ہے، ابطالِ شرک کے سیاق کی آیت ہے، اس سے استدلال درست نہیں، سورہ نساء کی آیت ۵ ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما وارزقوھم فیھا واکسوھم طور پر اموال یتامیٰ کے سیاق میں آئی ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک یتیم اس قابل نہ ہوں کہ اپنے اپنے اموال کی نگرانی کر سکیں، ولی کو چاہیے کہ اموال اپنے کنٹرول میں رکھے اور بعض گذراوقات کے لیے دیتا رہے۔ اس کے بعد کی آیت میں صاف حکم دیا گیا کہ جب اصل مالک رشد کو پہنچ جائیں تو ان کی ملکیت انہی کے حوالے کر دو۔ اس رشد سے مراد بلوغ اور انتظامی سوجھ بوجھ ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب تک یتیم یہ نہ ثابت کر دیں کہ وہ اپنے تصرف میں کوئی بے راہ روی اختیار نہ کریں گے اس وقت تک ان کا مال ان کے حوالے ہی نہ کیا جائے۔

فاضل مصنف کی اسی ذہنیت کے آئینہ دار وہ اجتہادات بھی ہیں جو انھوں نے جدید اسلامی قانون سازی کے باب میں پیش کیے ہیں۔ مثلاً وہ مسلمان حکمرانوں کے لیے یہ حق تسلیم کرتے ہیں کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کا فاضل مال ضبط کر لے اور بعض ملک کے متوسط معیار زندگی سے متجاوز نہ ہونے دے کیونکہ سرمایہ ان لوگوں میں پست اخلاق پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے (ص ۳۵۵) اسی طرح مصنف اسلام کی صدقہ و خیرات کی تلقین کو صرف ایک ایسا مرہم سمجھتے ہیں جو پھوڑے کو چھپا دیتا ہے مگر اس کا علاج نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مال سے مرض اور جہالت کا مقابلہ کرنے کا اہل ہو جائے، اور امیر و غریب تعلیم اور علاج کی ایک ہی معیار کی سہولتیں پائیں (ص ۳۵۶) ترکہ کی تقسیم میں وہ ترکہ پر ایک ٹیکس لگانے اور اس سے حاصل شدہ رقم کو یتامیٰ و مساکین پر خرچ کرنے کی رائے دیتے ہیں (ص ۳۵۷) ان تمام اجتہادات کی دلیل وہ شریعت کے مصالح مرسلہ یا سدِ ذریعہ کے اصول سے لاتے ہیں، حالانکہ ان اصولوں کی رو سے وہ کسی طرح اپنی کوشش میں حق بجانب نہیں ہیں۔

اسلام نے ہر شخص کو بلا رعایت مذہب و ملت دنیا کی زندگی میں مسابقت اور جد و جہد کی آزادی عطا کی ہے۔ مسلمانوں کے لیے حرام و حلال کی حدود واضح کر دی گئی ہیں۔ اگر کوئی مسلمان کسبِ مال میں ان حدود کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو اس کا مال اصلاً حلال ہے اور خدا کی طرف سے اسے اپنے مال پر

حدود الٰہی کے اندر تصرف کا حق حاصل ہے۔ ایک اسلامی حکومت خدا کے بخشے ہوئے اس اختیار میں سے خدا ہی کے متعین کردہ حقوق تو وصول کر سکتی ہے لیکن اس اختیار کو کالعدم کرنے کا حق کسی طرح نہیں رکھتی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے رسولؐ یا خلفائے راشدینؓ نے "سرمایہ داروں" سے شرعی حقوق تو جبراً بھی وصول کیے ہیں لیکن تاریخ میں ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ انھوں نے کسی موہوم خطرے کے پیش نظر ان کی جائدادیں محض سرکار ضبط کر کے بیت المال سے ان کا راشن مقرر کر دیا ہو۔ مصنف صدقہ و خیرات کی تلقین کو جو اتنا غیر مفید پا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت نہ تو عوام کے اندر انفاق کا جذبہ موجود ہے، نہ حکومتیں اس جذبہ کو ابھارنے کے لیے صحیح تدبیریں اختیار کرتی ہیں، اس زمانہ میں ہر کام قانون کے ڈنڈے سے لینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اسلام میں جبری نیکیوں کی قدر و قیمت کچھ زیادہ نہیں ہے۔ ترکہ کی تقسیم کے موقع پر غریبوں سے حسن سلوک کرنے کے حکم سے مصنف نے اگر یہ سمجھا ہے کہ اسلام نے میراث میں ان کا بھی حق رکھا ہے تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ورثہ کی تقسیم کی مکمل وضاحت کتاب و سنت میں موجود ہے۔ مصنف اگر غربا کا حصہ بھی ترکہ میں مقرر کرنے کے حق میں ہیں تو ان کی یہ بات قرآن کی نصوص پر اضافہ کی حیثیت تو رکھتی ہے لیکن اسے مصالح مرسلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ مولفۃ القلوب کے بارے میں حضرت عمرؓ کے فیصلہ سے مصنف نے جو استدلال بیان کیا ہے وہ اس لیے صحیح نہیں کہ حضرت عمرؓ نے مولفۃ القلوب کی مد کبھی کالعدم نہیں کی۔ یہ مد حسب الضرورت ہی استعمال کی جاتی ہے اور حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں ایسی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

فاضل مصنف سرمایہ داری سے بہت متنفر ہیں ان کی اس نفرت کا اندازہ اس امر سے بخوبی ہوتا ہے کہ یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں حضرت عمرؓ ہی کا مالی نظام جاری رکھا، انھوں نے حضرت عثمانؓ کی خلافت کو ایسے انداز سے پیش کیا ہے گویا ان کے زمانہ میں سرمایہ دارانہ نظام قائم ہو گیا تھا اور "مزدور طبقہ" اس نظام کا جوا اتارنے کے لیے متحد ہو گیا۔ مصنف کی ہمدردیاں اسی "مزدور طبقہ" کے ساتھ ہیں۔ فرماتے ہیں:-

"(حضرت عثمانؓ کی مالی پالیسی) نے اسلامی جماعت میں زبردست معاشی تفاوت اور سماجی امتیازات پیدا کیے نیز اس نے ایک ایسے طبقہ اشراف (ARISTOCRATS) کو جنم دیا جو خود بے عمل تھا اور بغیر محنت مشقت کے اس کا رزق ہر چہار جانب سے آکر ملتا رہتا... اگر ایک طرف دولت کا

مرکز اور اس کی فراوانی تھی تو دوسری طرف اسی نسبت سے فقر و فاقہ اور خستہ حالی کا ظہور لازمی تھا۔ قدرتی طور پر غیظ و غضب اور انتقامی جذبات بھی پیدا ہو رہے تھے۔ یہ سارا مواد جمع ہوتا اور پکتا رہا تا آنکہ اس نے ایک ہیجان انگیز فتنہ کو جنم دے کر چھوڑا..... جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بعض لوگوں کے اندر روح اسلامی نے جوش کیا۔ ان میں نمائندہ شخصیت ابوذرؓ کی ہے جو ان میں سب سے زیادہ تیز اور انقلابی تھے۔" (ص ۲۸۹، ۲۹۳)

ہمارے نزدیک مصنف کا یہ سارا مطالعہ حالات محل نظر ہے۔ لیکن ہم صرف حضرت ابوذرؓ کی دعوت کی حقیقت واضح کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے کردار سے ہمارے ملک کے اشتراکیت پسند عناصر نے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اسلام قانونی طور پر پس انداز دولت کی ایک خاص مقدار وصول کر کے باقی کو حلال رستوں میں صرف کرنے کی اجازت دیتا ہے لیکن اس کی معیاری تعلیم یہ ہے کہ افراد کفایت کی زندگی بسر کریں اور اپنا فاضل مال راہ خدا میں خرچ کریں۔ یہی درجہ نیکی اور سعادت کا درجہ ہے لیکن حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایک طبقہ کے اندر یہ خیال پیدا ہو گیا کہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد آدمی آزاد ہے کہ اپنا مال جس طرح چاہے جمع کرے۔ حضرت ابوذرؓ نے لوگوں کو ان کی اس غلطی پر شدت سے ٹوکا اور جمع مال پر جو وعیدیں قرآن اور حدیث میں وارد ہیں وہ لوگوں کو سنائیں اس سے اس طبقہ کے اندر اشتعال پیدا ہوا اور حضرت عثمانؓ نے رفع شر کے خیال سے حضرت ابوذرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مدینہ سے باہر چلے جائیں۔

ہمیں سید قطب صاحب کی ذات سے ہمیشہ عقیدت رہی ہے اور ہماری خواہش یہی تھی کہ ان کی یہ بلند پایہ تصنیف صحیح اسلام کی نمائندہ ثابت ہوتی، لیکن مذکورہ بالا افکار کو پڑھ کر ہمیں افسوس ہوا اور اس کے ساتھ تعجب اس بات پر ہوا کہ جماعت اسلامی ہند نے یہ افکار بغیر کسی نقد و احتساب کے شائع کر دیے ہیں حالانکہ مولانا ابو اللیث اصلاحی، مولانا جلیل احسن ندوی اور مولانا ابوالحسن علی کے نام اس بات کے لیے کافی ضمانت ہیں کہ عام مسلمان اس کتاب کو خالص اسلام کی نمائندگی کرنے والی سمجھیں۔ معلوم نہیں ان بزرگوں سے یہ تسامح کس طرح ہو گیا؟

فاضل مؤلف کا مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں نقطہ نظر یہ ہے کہ حکومت کے کاموں میں صحیح اسلامی روح خلافت راشدہ کے عہد میں (باستثناء عہد حضرت عثمانؓ) کارفرما رہی۔ ان کے نزدیک حضرت علیؓ

کی خلافت حضرات شیخین کی خلافت کا فطری تسلسل ہے اور حضرت عثمان کا عہد ایک خلا ہے جو درمیان میں حائل ہوگیا تھا (ص۲۸۷) یہ مسلمانوں کا "سوءِ اتفاق" تھا کہ حضرت عمر کے بعد حضرت علی کا انتخاب نہ ہوسکا (ص۲۵۵) چونکہ "حضرت عثمان اور مروان کے عہد میں" اسلام کے تصورِ حکمرانی سے انحراف واقع ہوگیا تھا اس لیے حضرت علی کو یہ مشن لے کر اٹھنا پڑا کہ حکام اور عا[illegible]س کو ایک بار پھر اسلام کے اصل تصورِ حکمرانی کا حامل بنائیں" (ص۲۷۰) چنانچہ خلیفہ بن کر "آپ نے اپنے نفس کو ابوبکر و عمر کی عزیمتوں کا پابند بنایا، عثمان بن عفان کی رخصتوں کا خوگر نہیں بنایا (ص۲۷۱) اور اسلامی روح کو ازسرِ نو زندگی بخشی۔ آپ کی وفات کے بعد معاویہ اور ان کے بعد دوسرے خلفاء نے اسلامی نظام کو خوب خوب تاخت و تاراج کیا، حتیٰ کہ اس کا کوئی مظہر اب موجود نہیں رہا۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم مصنف کے نقطۂ نظر سے یہاں بھی اتفاق نہیں کرسکتے۔ اولاً تو ہم سمجھتے ہیں کہ مصنف کے قلم نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ ان کا عہدِ خلافت، خلافتِ راشدہ کے درمیان ایک تاریک دور کی حیثیت سے نمایاں کیا گیا ہے اور مصنف ان کوششوں کو شاید سراہنا چاہتے ہیں جو اس دور کو "ختم" کرنے کے لیے کی گئیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

[" اس قسم کے جذبات جب عام ہوجاتے ہیں تو ان کا قدرتی نتیجہ صحیح یا غلط، بہرحال یہی ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اندر بغاوت کا مادہ ابھرنے لگے اور کچھ کے اندر انحطاط پیدا ہوجائے۔ جن لوگوں کے دلوں میں دین کی روح گھر کر چکی ہوتی ہے وہ ان باتوں پر خاموشی کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے خلاف جذبات ان کو بغاوت پر ابھارتے ہیں" (ص۲۶۹)]

مصنف نے یہاں یہ واضح نہیں فرمایا کہ مدینہ کے جلیل القدر صحابہ کے دلوں میں دین کی روح کیوں اتنی سرد ہوگئی تھی کہ انھوں نے "روحِ اسلام سے سرشار" حملہ آوروں کا ساتھ دینے کے بجائے ان کو خلیفہ کے مکان سے دور رکھنے کی کوشش کی۔

ثانیاً حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کا جو کردار مصنف نے پیش کیا ہے ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں کے بارے میں جو داستان عراقی تاریخ کی کتابوں میں کی گئی ہے اس کا بڑا حصہ بے سروپا ہے۔ امام ابن تیمیہ کی کتاب کے بعد اب الحمدللہ اردو میں بھی محمود احمد عباسی صاحب کی کوششوں سے ایک ایسی محققانہ کتاب آگئی ہے جو اس سلسلہ کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کردینے والی ہے۔

کتاب کے آخری ستر صفحات فکر انگیز مباحث پر مشتمل ہیں۔ ان میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلامی نظام موجودہ زمانہ میں قابلِ عمل ہے لیکن اس کے قیام کے لیے غیر معمولی جدوجہد کی ضرورت ہوگی اور اس جدوجہد میں ایمان کی مضبوطی کے ساتھ صبر و استقلال کی صفات بہترین زادِ راہ ہیں۔ مصنف ان کوششوں میں خالص اسلامی اصولوں ہی کو رہنما بنانا مفید سمجھتے ہیں اور مغربی طور طریقوں سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:۔

[" مسلمان جب فکر و نظر اور طریق و مسلک کے باب میں مغربی طریقوں کو مستعار لے کر اپنی زندگی کے احیاء کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں پہلے ہی قدم پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ جس زندگی کی تجدید کرنے چلے تھے بالآخر اسی کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں کیونکہ وہ اس واحد فطری طریقِ کار کو پہلے ہی قدم پر چھوڑ دیتے ہیں جس سے اسلامی زندگی کا احیاء ممکن ہے" (ص۳۲۶)]

مصنف یہاں جس نتیجہ تک پہنچے ہیں، ہماری رائے میں وہ بالکل حقیقت پسندانہ ہے۔ ان کی اسی طرح کی ایک حقیقت پسندانہ رائے یہ بھی ہے کہ اسلامی نظامِ زندگی کا احیاء محض اسلامی قانون کے نفاذ سے نہیں ہوسکتا بلکہ قانون کے ساتھ ہمیں عوام میں اسلامی فکر پیدا کرنے کی کوشش بھی کرنی چاہیے۔ مصنف کی رائے میں مسلمان قوموں میں صرف اسلامی قانون ہی کامیابی سے چل سکتا ہے کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ فرماتے ہیں:۔

[" حقیقت یہ ہے کہ کسی ماحول کے لیے وہی نظام موزوں ہوتا ہے جس نے خود اسی ماحول کے اندر فطری طور پر ارتقاء کے مراحل طے کیے ہوں۔ کسی اجنبی ماحول کے نظام کو جس نے اس مخصوص فضا میں ارتقاء کے فطری مراحل نہ طے کیے ہوں، لاکر اس پر مسلط کردینا کبھی سازگار نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا نہ صرف اس دین کی حقیقت سے ناواقف ہونے، بلکہ خود انسانی زندگی اور انسانی سماج کی نفسیات سے جہالت کا ثبوت ہے" (ص[illegible])]

مصنف مسلمانوں کے احیاء کے لیے ان میں اسلامی سپرٹ کی ترویج کے ساتھ نظامِ تعلیم، قانون، تاریخ، ادب و فلسفہ میں ازسرِ نو تحقیق و تعلیم کی دعوت دیتے ہیں۔ انھوں نے اس بارے میں کام کا مکمل نقشہ پیش کیا ہے جو واقعتاً مفید اور اہلِ فکر کی توجہ کا مستحق ہے۔

کتاب میں چند ایک جگہ مصنف نے اپنی صحیح بات کی دلیل آیات کی غلط تاویل کے ذریعے پیش کی ہے، حالانکہ اگر وہ غلط تاویل کا سہارا نہ بھی لیتے تو ان کی بات محکم ہوتی۔ مثلاً محنت کی اہمیت و قدر جتانے

کے لیے انھوں نے آیت قل اعملوا فسیری اللہ عملکم و رسولہ والمومنون (توبہ ۱۰۵) اور عیسائیت کی دنیا سے بے تعلقی کی تعلیم کے برعکس اسلام کی تعلیم بتانے کے لیے لا تنس نصیبک من الدنیا (القصص ۷۷) اور فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ (ملک) کو دلائل کے طور پر استعمال کیا ہے۔ حالانکہ ان میں سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔

فی الجملہ کتاب کا مطالعہ بہت مفید اور فکر انگیز ہے۔ مصنف کا نقطۂ نظر عام طور پر تعمیری ہے۔ ترجمہ معیاری ہے۔ کتاب مجلد ہے اور سفید کاغذ پر اچھی چھپی ہے۔ قیمت چھ روپے ہے۔

(خ۔م)

ماہنامہ
رضوان لکھنؤ
مسلمان خواتین کا دینی ترجمان
خاص نمبر
ماہ نومبر ۱۹۶۰ء کو شائع ہو رہا ہے
اس کے علاوہ
دفتر ماہنامہ رضوان گوئن روڈ لکھنؤ

مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی
مندرجہ ذیل کتابیں ہمارے یہاں سے طلب فرمائیں
مفردات القرآن (بزبان عربی) ایک روپیہ چار آنے
اسباق النحو حصہ اول (اردو) ایک روپیہ
اسباق النحو حصہ دوم " بارہ آنے
تحفۃ الاعراب (منظوم عربی گرامر) چار آنے
امثال آصف الحکیم (اردو) عربی ادب سیکھنے کی پہلی کتاب (عربی)

مکتبہ میثاق کی پہلی پیشکش
مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر
تدبر قرآن
تفسیر آیت بسم اللہ و سورہ فاتحہ
اس کتاب کو خود پڑھیے اور اپنے دوستوں کو پڑھنے کے لیے دیجیے تاکہ قرآن مجید کے سمجھنے کا ذوق پیدا ہو۔ ۸/۲۰×۳۰ صفحات ۳۴۶ ۔ ہدیہ ۱۲؍

ملنے کا پتہ: مکتبہ میثاق رحمان پورہ، اچھرہ لاہور

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق ۱۷۔ احمد سٹریٹ رحمان پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔